www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

الرسالہ

Al-Risala

November-December 2022 • Rs. 40

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Nov-Dec 2022 | Volume 47 | Issue 6

Editor-in-Chief
Prof. Farida Khanam

Assistant Editor
Farhad Ahmad

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: cs.alrisala@gmail.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹ 40 per copy
Subscription by Book Post	₹ 200 per year
Subscription by Regd. Post	₹ 400 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Al-Risala Monthly
Punjab National Bank
A/c No. 0160002100010384
IFSC Code: PUNB0016000
Nizamuddin West Market Branch

To order books by Maulana Wahiduddin Khan, please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871
Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

Goodword Bank Details
Goodword Books
State Bank of India
A/c No. 30286472791
IFSC Code: SBIN0009109

UPI
UNIFIED PAYMENTS INTERFACE

تحریر

مولانا وحید الدین خاں

فہرست

علم سے آغاز	4
دنیا ایک سفر	5
کاؤنٹ ڈاؤن ہو رہا ہے	6
اہل کتاب سے استفادہ	7
مطالعۂ حدیث (شرح مشکاۃ المصابیح)	9
دعا کی حقیقت	20
مکمل اسلام، ربانی اسلام	21
اہل جنت	23
عمل کی دعوت	24
بڑھاپے کا تجربہ	25
چیلنج کی صورتِ حال	26
بائی ٹائم اسٹریٹجی	28
بات کرنے کا طریقہ	29
ڈائری 1986	30
ایگو کو میچ کرنا	42
بہترین خطا کار	43
مولانا کے بعد	44
تعارفِ کتب	47
خبر نامہ اسلامی مرکز	49

Printed and published by Saniyasnain Khan
on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd.
A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan Total Pages: 52

علم سے آغاز

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم 570ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ 610ء میں آپ پر خدا کی طرف سے پہلی وحی اتری۔ یہ ابتدائی کلام جو خدا کی طرف سے آپ کو ملا وہ یہ تھا:

ٱقْرَأْ بِٱسْمِ رَبِّكَ ٱلَّذِي خَلَقَ ۔ خَلَقَ ٱلْإِنسَٰنَ مِنْ عَلَقٍ ۔ ٱقْرَأْ وَرَبُّكَ ٱلْأَكْرَمُ ۔ ٱلَّذِي عَلَّمَ بِٱلْقَلَمِ ۔ عَلَّمَ ٱلْإِنسَٰنَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (96:1-5)۔ یعنی، ''پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو علق سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا''۔

قرآن میں اترا ہوا یہ پہلا کلام الٰہی بتاتا ہے کہ کسی حقیقی عمل کا آغاز کیا ہے۔ یہ آغاز علم ہے۔ یعنی انسان کو باشعور بنانا۔ اس کے اندر ذہنی تبدیلی لاکر فکری انقلاب پیدا کرنا۔ یہی انسانوں کے درمیان کسی حقیقی تحریک کا آغاز ہے۔ اس دنیا میں وہی انسانی تحریک کامیاب ہوسکتی ہے جو شعور کی بیداری سے اپنے کام کا آغاز کرے۔ رسول اللہ نے علم کا پیغام دیا جو ابدی اہمیت کا حامل تھا۔ جو حال سے لے کر مستقبل تک انسان کے کام آنے والا تھا۔ اور جو اپنے وسیع انطباق (universal application) کے اعتبار سے دوسرے تمام پہلوؤں کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔

علم طاقت ہے۔ علم اس دنیا میں سب سے بڑا ہتھیار ہے، ایک فرد کے لیے بھی اور پوری انسانیت کے لیے بھی۔ علم کا آغاز مائنڈ سے ہوتا ہے مگر وہ پوری خارجی دنیا کو مسخر کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

علم سے آدمی کی تکمیل ہے۔ علم کے بغیر ایک انسان ادھورا انسان ہے۔ علم کے بعد وہ مکمل انسان بن جاتا ہے۔ علم سے خالی انسان صرف اپنی ذات کو جانتا ہے۔ علم کے حصول کے بعد آدمی پوری کائنات کو اپنے اندر سمولیتا ہے۔ علم انسان کے ذہنی افق کو بلند کرتا ہے۔ علم انسان کے اندر تخلیقی فکر (creative thinking) پیدا کرتا ہے۔ علم انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ معرفت حق کے اعلیٰ درجات تک پہنچے۔ علم کسی ناقص انسان کو ایک کامل انسان بنا دیتا ہے۔

دنیا ایک سفر

ملکہ ایلزبتھ دوم 8 ستمبر 2022ء کو 96 سال کی عمر میں وفات پا گئیں۔ وہ 70 سال تک انگلینڈ کی ملکہ رہیں۔ پوری دنیا میں کئی دنوں تک ملکہ کے موت کی خبر برننگ نیوز کی حیثیت سے چلتی رہی۔ اگر غور کیا جائے تو گویا یہ خبر انسانوں کے لیے ایک فطری حقیقت کی یاد دہانی تھی۔ یعنی اس دنیا کے ہر انسان کو ایک دن اسی طرح اس دنیا سے چلے جانا ہے، جس طرح ملکہ گئیں۔ کسی کو موت سے چھٹکارا نہیں۔

ایک دن کا واقعہ ہے۔ میں اپنے کمرہ میں لیٹی ہوئی تھی، اس وقت مجھے ہلکی سی نیند آئی۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں سی 29 نظام الدین ویسٹ کے جس کمرہ میں موجود ہوں، وہ ایک ٹرین کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ٹرین کے اوپر جہاں سامان رکھنے کے لیے جگہ بنی ہوتی ہے، وہاں میں کوئی کپڑا رکھ رہی ہوں۔ ٹرین بالکل سادہ ہے۔ کپڑا بھی سفید چادر کی طرح ہے۔

یہ خواب دیکھ کر میرا مائنڈ ٹرگر ہوا۔ میں سوچنے لگی کہ ہم لوگ اِس دنیا کے گھر کو غیر شعوری طور پر اپنا مستقل ٹھکانا (permanent abode) سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن یہ ایک غلط فہمی کا معاملہ ہے۔ یہ ایک سراب (mirage) ہے۔ مرتے ہی حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ دنیا ایک پلیٹ فارم کے سوا کچھ نہیں تھی۔ صاحب معرفت وہی لوگ ہیں جو مرنے سے پہلے اس حقیقت کا ادراک کرلیں۔ اس سلسلے میں ایک بامعنی حدیثِ رسول ابن عمر رضی اللہ عنہما کے الفاظ میں اس طرح آئی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا میں اس طرح زندگی گزارو، جیسے تم اجنبی ہو یا سفر کرنے والے۔ ابن عمر فرمایا کرتے تھے کہ شام ہو جائے تو صبح کا انتظار نہ کرو اور صبح کے وقت شام کا انتظار نہ کرو۔ اپنی صحت کو مرض سے پہلے غنیمت جانو اور زندگی کو موت سے پہلے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6416)۔

مولانا وحید الدین خاں صاحب نے لکھا ہے کہ "یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ انسان آج اپنے آپ کو موجودہ دنیا میں پاتا ہے۔ لیکن ایک دن آتا ہے جب کہ ہر عورت اور مرد اس دنیا سے نکال کر اگلی ابدی دنیا کی طرف منتقل (transfer) کر دیا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے وہ دنیا ہمیشہ کے لیے چھوٹ جاتی ہے، جس کو وہ غیر شعوری طور پر اپنا مستقل ٹھکانا سمجھتا تھا۔ دانش مند وہ ہے جو اُس آنے والی ابدی دنیا کو اپنا اصل ٹھکانا سمجھے اور اس کے لیے تیاری کرے" (ماخوذ الرسالہ، نومبر 2016)۔ ڈاکٹر فریدہ خانم

کاؤنٹ ڈاؤن ہو رہا ہے

سورہ العصر میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو حقیقی تعمیر کے لیے ٹائم مینجمنٹ کی ضرورت ہے۔ اس ٹائم مینجمنٹ کے بغیر کسی کے لیے حقیقی ترقی کو پانا ممکن نہیں۔ کیوں کہ اس دنیا میں کامیاب ہونے کے لیے آدمی کو خود کوشش کرنا ہے، خواہ وہ دنیا کی کامیابی ہو یا آخرت کی۔ جب کہ ناکامی کے لیے کسی کوشش کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے آپ انسان کی طرف بھاگی چلی آرہی ہے۔ سورہ العصر کا ترجمہ یہ ہے: زمانہ گواہ ہے۔ بے شک انسان گھاٹے میں ہے۔ سوا ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیا اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔ (103:1-3)

قرآن کی اس سورہ میں زندگی کی ایک اہم حقیقت کے بارے میں انسان کو آگاہ کیا گیا ہے۔ ایک بزرگ نے کہا کہ سورۃ العصر کا مطلب میں نے ایک برف بیچنے والے سے سمجھا جو بازار میں آواز لگا رہا تھا کہ لوگو، اس شخص پر رحم کرو جس کا اثاثہ گھل رہا ہے، لوگو، اس شخص پر رحم کرو، جس کا اثاثہ گھل رہا ہے (ارْحَمُوا مَنْ يَذُوبُ رَأْسُ مَالِهِ)۔ اس پکار کو سن کر میں نے اپنے دل میں کہا کہ جس طرح برف پگھل کر کم ہوتی رہتی ہے اسی طرح انسان کو ملی ہوئی عمر بھی تیزی سے گزر رہی ہے۔ آدمی اگر اپنی مہلتِ عمر کو استعمال نہ کرے تو آخر کار اس کے حصہ میں جو چیز آئے گی وہ صرف ہلاکت ہے (تفسیر کبیر امام رازی، جلد 32، ص 278)۔

انسان ہر لمحہ زندگی سے موت کی طرف جا رہا ہے۔ ہر لمحہ انسان کا کاؤنٹ ڈاؤن ہو رہا ہے۔ یہ فطرت کا ایک لازمی قانون ہے۔ اس قانون کو دوبارہ الٹی طرف چلایا نہیں جا سکتا۔ مثال کے طور پر ایک شخص کی مقرر عمر اگر 80 سال ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی اس کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو گیا۔ ہر نیا دن، آنے والا سال اس کی عمر میں کمی کا اعلان ہے۔ گویا کہ اس کی عمر کا سفر اس طرح ہو رہا ہے:

.....70، 71، 72، 73، 74، 75، 76، 77، 78، 79، 80 ←

اسی کاؤنٹ ڈاؤن (الٹی گنتی) کو قرآن کی مذکورہ سورہ میں خسران کہا گیا ہے۔ یعنی عمر برف کی طرح پگھلتی جا رہی ہے۔ انسان اگر اپنی عمر کو مذکورہ چار قسم کے عمل کے لیے استعمال نہ کرے تو وہ ابدی گھاٹے میں ہے۔

اہل کتاب سے استفادہ

قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (16:43)۔ یعنی اور ہم نے تم سے پہلے بھی آدمیوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، پس اہل علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔

مفسرین نے اہل الذکر سے اہل کتاب مراد لیے ہیں، یا وہ لوگ جو پچھلی امتوں اور پچھلے پیغمبروں کے تاریخی حالات کا علم رکھنے والے ہیں۔ مگر توسیعی معنی کے اعتبار سے اس سے مراد موجودہ زمانے کے جدید تعلیم یافتہ یہودی اور مسیحی علما ہیں۔ اس آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا، جب کہ اہل کتاب وہ باتیں جانیں گے، جن سے مسلم علما زیادہ باخبر نہ ہوں گے، اور ان کے لیے موقع ہوگا کہ وہ اہل کتاب کی جدید تحقیقات سے اپنے دینی علم میں اضافہ کریں۔

اصل یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں یہود اور مسیحی قوموں کے لیے ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ اپنے قدیم وطن سے نکل کر ڈائسپورا (diaspora) میں چلے گئے۔ پھر ان کو موقع ملا کہ وہ مغرب کے جدید علوم کو سیکھیں۔ جدید علوم سے باخبر ہونے کی بنا پر انھوں نے سائنسی دریافتوں کو جانا، اور ان کو اپنی مذہبی کتابوں کی شرح کے لیے استعمال کیا۔ مگر مسلم اہل علم اس سے بے خبر رہے۔

مثلاً جدید سائنسی دریافت کے نتیجے میں بالواسطہ انداز میں خدائی حقیقتیں قابل فہم ہوگئیں۔ مگر یہ دریافتیں نیوٹرل انداز میں تھیں۔ چنانچہ یہودی علما اور عیسائی علما نے انطباقی انداز میں خدا کے وجود پر بڑی تعداد میں کتابیں اور مقالات لکھیں۔ ان میں سے ایک کتاب یہ ہے:

The Evidence of God in an Expanding Universe: Forty American Scientists Declare Their Affirmative Views on Religion (John Clover Monsma, G. P. Putnam's Sons, 1958, pp. 250)

خدا کی سائنسی شہادت پر یہ کتاب یہودی اور عیسائی اہل علم کے مضامین پر مشتمل ہے۔

اسی طرح علم الانسان (Anthropology) اور علم الآثار (Archaeology)، وغیرہ جدید ڈسپلنز ہیں۔ ان کے ذریعے جدید سائنسی اصول کی روشنی میں انسان کی قدیم تہذیب اور تاریخ، وغیرہ کا

مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ان ڈسپلنز کی روشنی میں یہودی اور عیسائی علما نے وہ تاریخی حقائق دریافت کیے ہیں، جو بائبل اور قرآن کے مشترک موضوعات تھے۔ مثلاً پیغمبر ابراہیم کا بیان، پیغمبر موسیٰ اور فرعون کا واقعہ، حضرت مسیح کی زندگی، یہاں تک کہ قرآن کے تاریخی استناد (historicity) پر بھی انھوں نے تحقیق کی، وغیرہ۔ ان تحقیقات کے ذریعے یہودی اور عیسائی علما نے مذہبی شخصیات اور واقعات کے تاریخی استناد کو ثابت کرنے کا کام کیا ہے۔ ان یہودی اور مسیحی علما کی سائنسی تحقیقات کی بنا پر اب مذہبی تاریخ دیگر تاریخی حقیقتوں کی طرح ثابت شدہ حقیقتیں بن چکی ہیں۔

بائبل اور قرآن میں بنیادی موضوع مشترک ہیں، مثلاً خدا کا وجود اور انبیاء کے حالات، وغیرہ۔ اس بنا پر اہلِ کتاب کی یہ تحقیقات بالقوہ طور پر (potentially) اسلام کی تائید کا کام ہیں۔ یہ مسلم علما کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس پوٹنشل کو ایکچول بنائیں تاکہ اسلام کی صداقت جدید علمی معیار پر ثابت شدہ حقیقت بن کر انسانوں کے سامنے آسکے۔ فرانس کے ڈاکٹر موریس بکائی (وفات 1998ء) کی کتاب "بائبل، قرآن اور سائنس" اسی قسم کی ایک کوشش ہے۔ اس کے انگریزی ترجمے کا ٹائٹل یہ ہے:

The Bible, The Quran and Science by Dr. Maurice Bucaille

چوں کہ جدید علوم سے بے خبری کی بنا پر مسلم اہل علم اس میدان میں پیچھے ہیں۔ اس لیے ان کے لیے یہ موقع ہے کہ وہ یہودی اور کرشچن علما کی دریافتوں سے اسی طرح استفادہ کریں جس طرح وہ کوئی دوسرا دینی علم حاصل کرتے ہیں۔ تاکہ خدا کا دین وقت کے مسلّمہ علمی معیار پر مدلل ہو کر انسانوں کے مائنڈ کو ایڈریس (address) کرے۔

اعلان

سی پی ایس انٹرنیشنل، نئی دہلی کی جانب سے انڈیا کے مدارس اسلامیہ کو مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتابیں ہدیے میں بھیجی جارہی ہیں۔ اس مقصد کے تحت ادارہ کی جانب سے مسٹر آصف خان (9918578630) مدارس میں جاتے ہیں، اور وہاں کی انتظامیہ سے اجازت حاصل کرتے ہیں۔ پھر ان مدارس کو کتابیں بھیجی جاتی ہیں۔ قارئین الرسالہ اور دوسرے خواہش مند حضرات سے گزارش ہے کہ وہ آصف صاحب سے رابطہ قائم کرکے اس سلسلے میں ان کا تعاون فرمائیں۔ شکریہ

مطالعۂ حدیث

شرح مشکاۃ المصابیح

12

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں، یہاں تک کہ وہ اس کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور وہ نماز قائم کریں اور وہ زکاۃ ادا کریں۔ پھر جب وہ ایسا کریں تو وہ اپنے خون اور اپنے مال کو مجھ سے بچالیں گے، سوا اسلامی حق کے، ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 25، صحیح مسلم، حدیث نمبر 22)

اس حدیث میں وہی بات بتائی گئی ہے، جو سورہ التوبہ کی ابتدائی آیتوں میں بیان کی گئی ہے۔ اس حدیث میں لوگوں (الناس) سے مراد قدیم عرب کے وہ مشرکین ہیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر تھے۔ ان کے اوپر براہِ راست پیغمبر کے ذریعہ اتمام حجت کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ لوگ دشمنی پر اڑے ہوئے تھے۔ اس لیے قانونِ الٰہی کے مطابق، ان کے لیے دو میں سے ایک کا انتخاب تھا— وہ یا تو اسلام قبول کریں یا قتال کے لیے تیار ہو جائیں۔ مگر ابتدائی مخالفت کے بعد انہوں نے اسلام قبول کرلیا، اس لیے ان پر مذکورہ قانونِ الٰہی کے نفاذ کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

پیغمبر اسلام کی معاصر قوم کے سوا دوسری قوموں کے لیے ایسا قانون نہیں۔ دوسری قوموں کے لیے صرف پرامن دعوت ہے اور بس۔ پیغمبر کے بعد اب کسی بھی قوم سے اس قسم کا معاملہ نہیں کیا جائے گا۔

13

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو ہماری طرح نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کو اپنا قبلہ بنائے۔ اور ہمارے ذبیحہ کو کھائے تو وہ مسلمان ہے جس کے لیے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ ہے۔ تو تم اس کے ذمہ کو نہ توڑو (صحیح البخاری، حدیث نمبر 391)۔

اس حدیث میں ذمہ سے مراد وہ امن یا امان ہے جو ایک مسلم معاشرہ میں کسی کو دیا جاتا ہے۔ ایک شخص اگر مسلمان ہونے کا دعوی کرے اور اسلام کے ظاہری احکام پر عمل کرے تو اس کو مسلم معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت سے قبول کرلیا جائے گا۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اس کی مخفی نیت کی بنیاد پر اس کے خلاف کوئی حکم لگائے اور نہ کسی کو یہ حق ہوگا کہ وہ کسی شخص کو بطور مسلمان قبول کرنے کے لیے مذکورہ شرطوں کے سوا کسی اور عملی شرط کا مطالبہ کرے۔

14

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک اعرابی آیا۔ اس نے کہا کہ مجھے ایسا عمل بتائیے کہ جب میں اس پر عمل کروں تو میں جنت میں چلا جاؤں۔ آپ نے فرمایا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ اور تم فرض نماز کو قائم کرو اور فرض زکاۃ ادا کرو۔ اور تم رمضان کے روزے رکھو۔ اعرابی نے کہا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں ان پر نہ کسی چیز کو بڑھاؤں گا اور نہ کسی چیز کو گھٹاؤں گا۔ جب وہ واپس ہونے کو ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی ایک جنتی انسان کو دیکھنے کی خوشی حاصل کرنا چاہے وہ اس اعرابی کو دیکھ لے۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 1397، صحیح مسلم، حدیث نمبر 14)

اس حدیث میں جو اعمال بتائے گئے ہیں وہ اسلام کے بنیادی اعمال ہیں۔ یہ اعمال جس آدمی کے وجود میں حقیقی طور پر شامل ہوجائیں وہ اس کی پوری زندگی میں سما جائیں گے، وہ اس کی پوری شخصیت کو اللہ کے رنگ میں رنگ دیں گے۔

15

سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول مجھے اسلام کے بارے میں ایسی بات بتائیے کہ پھر میں اس کے بارے میں کسی اور سے نہ پوچھوں۔ آپ نے فرمایا کہ تم کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا، پھر تم اس پر جم جاؤ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 38)۔

اللہ پر ایمان لانا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ اس بات کا اقرار ہے کہ میں نے شعوری فیصلہ کے تحت اللہ کو اپنا رب ومعبود بنالیا۔ اس قسم کا شعوری فیصلہ پورے معنوں میں آدمی کے فکر وعمل کے لیے

ایک کامل رہنما بن جاتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر موڑ پر آدمی سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ ایسے تمام مواقع پر اپنے فیصلہ کے اوپر پوری طرح قائم رہنا، اسی کا نام مذکورہ حدیث میں استقامت ہے۔ اور جنت انہیں لوگوں کے لیے ہے جو ایمان کے بعد عملی استقامت کا ثبوت دیں۔

16

طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نجد کا ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ (وہ دور تھا) اس لیے ہم اس کی دھیمی آواز سن رہے تھے۔ مگر یہ نہیں سمجھتے تھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آ گیا۔ تو وہ اسلام کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانچ وقت کی نمازیں دن میں اور رات میں۔ اس نے کہا کہ کیا میرے اوپر ان کے سوا بھی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، الا یہ کہ تم نفل نماز پڑھو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اور رمضان کے مہینے کے روزے رکھنا۔ اس نے کہا کہ کیا میرے اوپر اس کے سوا بھی ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں، اِلا یہ کہ تم نفل روزے رکھو۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زکاۃ کے بارے میں کہا۔ اس نے کہا کہ کیا میرے اوپر اس کے سوا بھی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، اِلا یہ کہ تم نفل صدقہ کرو۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ آدمی لوٹا اور وہ یہ کہہ رہا تھا کہ خدا کی قسم میں اس پر نہ زیادہ کروں گا اور نہ اس پر کمی کرونگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ آدمی کامیاب ہوگا، اگر اس نے سچ کہا۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 46، صحیح مسلم، حدیث نمبر 11)

اسلام میں متعین کچھ عبادتی فرائض ہیں۔ آدمی اگر سچا عبادت گزار بن جائے تو وہ فرض کے سوا زائد عبادت بھی کرنے لگتا ہے جس کو شریعت میں نفل کہا گیا ہے۔ اسی طرح جب آدمی کی زندگی میں عبادت کی روح پوری طرح پیدا ہو جائے تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اخلاق ومعاملات میں بھی اس کا اثر ظاہر ہونے لگتا ہے۔ خدا کی نسبت سے وہ عابد بن جاتا ہے، اور بندوں کی نسبت سے عادل۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عبدالقیس کا وفد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کون لوگ ہو۔ انہوں نے کہا کہ (ہم) ربیعہ (قبیلہ سے ہیں)۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ اچھے آئے کہ نہ رسوا ہوئے اور نہ شرمندہ ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، ہم آپ کے پاس صرف حرام مہینے میں ہی آسکتے ہیں۔ ہمارے اور آپ کے درمیان (مخالف) قبیلہ مضر آباد ہے۔ پس آپ ہمیں کچھ بنیادی رہنمائی کر دیں جس سے ہم ان لوگوں کو باخبر کر دیں جو ہمارے پیچھے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ ہم جنت میں داخل ہو جائیں۔ انہوں نے آپ سے مشروبات کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے ان کو چار چیزوں کا حکم دیا اور چار چیزوں سے منع فرمایا۔ آپ نے ان کو ایک اللہ پر ایمان رکھنے کا حکم دیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ ایک اللہ پر ایمان رکھنا کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرنا اور زکاۃ ادا کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا اور یہ کہ تم مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ ادا کرو۔ اور آپ نے ان کو چار چیزوں سے منع فرمایا: ٹھلیا (الحنتم) سے اور توبنی (الدباء) سے اور تقیر سے اور تارکول والے پیالے (المزفت) سے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ ان باتوں کو یاد رکھو اور تمہارے پیچھے جو لوگ ہیں ان کو بتا دو (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 53، صحیح مسلم، حدیث نمبر 17)

مدینہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بااقتدار حیثیت حاصل ہوگئی تو آپ نے مختلف عرب قبائل کے پاس تبلیغی وفود بھیجنا شروع کیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ عرب قبائل مدینہ آکر آپ کی اطاعت قبول کرنے لگے۔ یہاں تک کہ عرب کے تمام قبائل مدینہ کی ریاست کی ماتحتی میں آگئے۔ اس حدیث میں ایک اصول یہ ملتا ہے کہ ایسے حالات میں جب کہ آدمی کے سامنے دو میں سے ایک کا انتخاب ہو — وہ یا تو اپنی مرضی سے ماتحتی قبول کرلے ورنہ اُس کو رسوائی اور شرمندگی کے ساتھ ماتحتی کو قبول کرنا ہوگا۔ ایسی حالت میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ باعزت صلح کو اختیار کرلیا جائے اور بے نتیجہ جنگ کا طریقہ چھوڑ دیا جائے۔

نوٹ: حدیث میں قدیم عرب کے چار برتنوں کا ذکر ہے جو شراب بنانے اور پینے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ "حنتم" شراب کی ٹھلیا۔ "دُباء" اندر سے کھوکھلا کیا ہوا کدو جو جگ کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ "نقیر" درخت کی جڑ کو اندر سے کھوکھلا کر کے اس میں شراب رکھتے تھے۔ "مزفت" تارکول سے بنا ہوا شراب کا برتن — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام پر روک لگانے کے ساتھ اسباب حرام پر بھی روک لگادی۔

18

عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا — اس وقت صحابہ کی ایک جماعت آپ کے پاس تھی — مجھ سے اس پر بیعت کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کروگے۔ اور تم چوری نہ کروگے اور تم زنا نہیں کروگے اور تم اپنی اولاد کو قتل نہیں کروگے اور تم کسی پر جھوٹا بہتان نہ لگاؤ گے اور تم معروف میں نافرمانی نہ کروگے۔ پھر تم میں سے جو شخص اس عہد کو پورا کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ تم میں سے کوئی شخص ان میں سے کسی گناہ کا ارتکاب کرلے اور وہ دنیا میں سزا پالے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔ اور کوئی شخص ان میں سے کسی گناہ میں مبتلا ہوجائے، پھر اللہ اس کی پردہ پوشی کرے تو اس کا معاملہ اللہ کے اوپر ہے، چاہے وہ اس کو معاف کرے یا وہ اس کو سزا دے۔ پھر ہم نے آپ سے اس پر بیعت کی۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 18، صحیح مسلم، حدیث نمبر 41)

اسلام میں جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان سے اپنے آپ کو دور رکھنا لازمی طور پر ضروری ہے۔ اگر کبھی کوئی شخص نفس سے مغلوب ہوکر وقتی طور پر گناہ میں مبتلا ہوجائے تو اس کو فوراً توبہ کرنا چاہیے۔ ایسے آدمی کو کبھی دنیا ہی میں کوئی تکلیف دے کر اس کے گناہ کو دھو دیا جاتا ہے اور کبھی اس پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ اللہ کے اوپر ہوتا ہے کہ وہ اپنے بندے سے آخرت میں کس طرح کا معاملہ فرمائے۔ یہ وقتی طور پر گناہ میں مبتلا ہونے کا معاملہ ہے۔ گناہ میں مستقل طور پر مبتلا رہنا اور توبہ کے بغیر مرجانا قابل معافی نہیں۔

19

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ انسان نے مجھے جھٹلایا حالانکہ یہ اسے سزاوار نہ تھا۔ اور اس نے مجھے گالی دی حالاں کہ یہ اس کے لیے سزاوار نہ تھا۔ پس اس کا مجھے جھٹلانا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ خدا مجھے دوبارہ نہ بنا سکے گا جس طرح اس نے مجھے پہلی بار بنایا۔ حالانکہ دوسری بار پیدا کرنا پہلی بار پیدا کرنے سے زیادہ آسان ہے۔ اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ نے اپنا بیٹا بنایا ہے۔ حالانکہ میں اکیلا اور بے نیاز ہوں جس نے نہ جنا اور نہ وہ جنا گیا اور نہ کوئی اس کے برابر ہے۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4974)۔

جب کوئی شخص خدا کے وجود پر شبہ کرتا ہے یا وہ اس کی صفات کمال کا انکار کرتا ہے تو اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک جھوٹ ہوتا ہے۔ خدا کے تخلیقی مظاہر خدا کے وجود کا یقینی ثبوت ہیں۔ اسی طرح کائنات کی معنویت خدا کی صفات کمال پر گواہی دیتی ہے۔ ایسی حالت میں جو آدمی خدا کو نہ پائے، جو خدا کی تخلیق میں خدا کے جلووں کو نہ دیکھے وہ یا تو اندھا ہے یا وہ جان بوجھ کر سرکشی کر رہا ہے۔

20

ایک اور روایت میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالی عنہ کہتے ہیں کہ (اللہ کا یہ ارشاد ہے کہ) انسان کا مجھ کو گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ کوئی میرا بیٹا ہے۔ حالانکہ میں اس سے پاک ہوں کہ میں کسی کو اپنی بیوی یا اپنا بیٹا بناؤں (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4482)۔

کسی انسان کے لیے یہ کہا جائے کہ اس کی ایک بیوی یا اس کا ایک بیٹا ہے تو یہ صرف ایک واقعہ کا اظہار ہوگا۔ لیکن اس قسم کی بات خداوندِ عالم کے لیے سخت ترین بہتان ہے۔ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ اس کی کوئی بیوی یا اس کا کوئی بیٹا ہو۔ انسان ایک نامکمل مخلوق ہے۔ اس کو اپنی تکمیل کے لیے بیوی اور بیٹے کی ضرورت ہوتی ہے مگر خدا اپنی ذات میں آخری حد تک ایک مکمل وجود ہے۔ ایک کامل اور مکمل خدا ہی موجودہ عظیم کائنات کو پیدا کر سکتا ہے۔

ایسی حالت میں کسی کو خدا کا بیٹا بتانا خدا کے رتبہ کو گھٹانا (degradation) ہے۔ اور اس قسم کا قول بلاشبہ بدترین قسم کا سبّ وشتم ہے۔

21

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے۔ انسان مجھ کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ وہ زمانہ کو گالی دیتا ہے۔ حالانکہ میں ہی زمانہ ہوں، میرے ہاتھ میں ہے معاملہ، میں رات اور دن کو پلٹتا ہوں (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 4826، صحیح مسلم، حدیث نمبر 2246)

انسان پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس کو زمانہ کا نتیجہ سمجھ کر زمانہ کو برا بھلا کہنے لگتا ہے۔ مگر اس قسم کے کلمات زمانہ پر نہیں بلکہ خدا پر پڑتے ہیں کیوں کہ زمانہ کوئی آزاد اور بااختیار چیز نہیں۔ وہ خدا کے حکم کے تابع ہے۔ یہ دراصل خدا ہے جو اپنے فیصلہ کو احوال زمانہ کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کو چاہئے کہ وہ ہر موقع پر خدا کی طرف رجوع کرے نہ کہ زمانہ کو ذمہ دار سمجھ کر شکایت کرے۔

22

ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تکلیف دہ بات کو سن کر اس پر صبر کرنے والا خدا سے زیادہ اور کوئی نہیں۔ لوگ خدا کی طرف بیٹے کی نسبت کرتے ہیں۔ مگر وہ انہیں معاف کرتا ہے اور انہیں رزق دیتا رہتا ہے (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 2099، صحیح مسلم، حدیث نمبر 2804)

انسان اگر کسی تکلیف دہ بات پر صبر کرتا ہے تو یہ اس کی مجبوری ہے۔ کیوں کہ انسان کا اختیار بہت محدود ہے۔ محدود اختیار کی بنا پر اس کے لیے یہ موقع نہیں کہ وہ کسی سے بھرپور انتقام لے سکے۔ لیکن خدا کامل اور لامحدود اختیار کا مالک ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنی مرضی کے خلاف باتوں کو دیکھتا ہے اور اس پر صبر کرتا ہے۔ اس کا سبب خود خدا کا قائم کردہ قانونی امتحان ہے۔ خدا ہر ایک کو آزادی دے کر اس کا امتحان لے رہا ہے۔ جب تک امتحان کی مدت ختم نہ ہو، یہ آزادی بھی ختم ہونے والی نہیں۔

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک گدھے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھا۔ میرے اور آپ کے درمیان کجاوہ کے پچھلے حصہ کی سوا اور کوئی چیز حائل نہ تھی۔ آپ نے فرمایا کہ اے معاذ، کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کا حق اپنے بندوں کے اوپر کیا ہے۔ اور بندوں کا حق اللہ کے اوپر کیا ہے۔

میں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کا حق اپنے بندوں پر یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور بندوں کا حق اللہ کے اوپر یہ ہے کہ وہ اس شخص کو عذاب نہ دے جو اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراتا ہو۔ پھر میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول کیا میں لوگوں کو اس کی خوش خبری نہ دے دوں۔ آپ نے فرمایا کہ لوگوں کو خوش خبری نہ دو ورنہ لوگ اسی پر بھروسہ کرلیں گے۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 2856، صحیح مسلم، حدیث نمبر 30)

نجات کا دارومدار ہر ایک کے لیے شرک کے انکار اور توحید کے اقرار پر ہے۔ مگر اس کا مطلب صرف زبان سے کچھ الفاظ کی تکرار نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ فکری انقلاب ہے جو آدمی کی پوری شخصیت کو بدل دیتا ہے۔ آدمی اندر سے لے کر باہر تک اور قول سے لے کر عمل تک ایک ربانی رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ یہ تبدیلی اتنی گہری ہوتی ہے کہ اگر اتفاقی سبب کے تحت وہ اپنے عقیدہ کے خلاف کوئی غلطی کر بیٹھے تو اس کی پوری شخصیت آخری حد تک تڑپ اٹھتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ غلطی اس کے لیے مزید اضافے کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اس حدیث میں بھروسہ کرنے (فَيَتَّكِلُوا) کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ باتوں کو زیادہ گہرائی کے ساتھ نہیں سمجھتے وہ اس کو صرف رسمی عقیدہ کے معنی میں لے لیں گے، اور کچھ الفاظ کو اپنی زبان سے دہرا کر یہ سمجھیں گے کہ انھوں نے آخرت میں اپنے آپ کو جنت کا مستحق بنا لیا ہے۔ حالانکہ حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔

24

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کجاوہ پر تھے اور معاذ بن جبل ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اے معاذ، انھوں نے کہا: میں حاضر ہوں خدمت میں۔ آپ نے فرمایا کہ اے معاذ، انھوں نے کہا میں حاضر ہوں خدمت میں۔ آپ نے تین بار اس طرح فرمایا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ ہر وہ شخص جو سچے دل سے گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، اللہ ضرور آگ کو اس پر حرام کر دے گا۔ انھوں نے کہا اے خدا کے رسول، کیا میں لوگوں کو اس کی خبر نہ دے دوں کہ وہ خوش ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر وہ بھروسہ کرلیں گے۔ پھر معاذ نے اپنی موت کے وقت اس کی خبر دی، گناہ سے بچنے کے لیے (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 128، صحیح مسلم، حدیث نمبر 32)۔

ایک سچائی جب کسی آدمی کے دل ودماغ میں آخری حد تک اتر جائے، وہ اس کے یقین واعتماد کا لازمی حصہ بن جائے، اس وقت جو کلمۂ اعتراف آدمی کی زبان سے نکلتا ہے اسی کا نام گواہی (شہادت) ہے۔ جو آدمی اس طرح کمال درجہ میں خدا اور رسول کی معرفت حاصل کرلے اور پھر اس کا سچا اعتراف کرے تو یہ اعتراف اس کی پوری شخصیت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ ایسا اعتراف اللہ کی نظر میں اتنا قیمتی ہوتا ہے کہ اس کے اوپر جہنم کی آگ حرام کر دی جاتی ہے۔

جو انسان شعوری دریافت کے درجہ میں خدا کی خدائی کا اعتراف کرے، اس کا پورا وجود معرفت رب میں ڈھل جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا مزکّٰی شخصیت (purified soul) بن جاتا ہے جو جہنم کی دسترس سے باہر ہو چکا ہو۔

25

ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس وقت آپ کے اوپر ایک سفید کپڑا تھا اور آپ سو رہے تھے۔ پھر میں آپ کے پاس آیا تو آپ جاگ چکے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی بھی بندہ جو یہ کہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر وہ اسی پر مر جائے تو وہ

ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ میں نے کہا، اگر چہ اس نے زنا کیا اگر چہ اس نے چوری کی۔ آپ نے فرمایا: اگر چہ اس نے زنا کیا، اگر چہ اس نے چوری کی۔ میں نے کہا، اگر چہ اس نے زنا کیا، اگر چہ اس نے چوری کی۔ آپ نے فرمایا: اگر چہ اس نے زنا کیا، اگر چہ اس نے چوری کی۔ میں نے کہا، اگر چہ اس نے زنا کیا، اگر چہ اس نے چوری کی۔ آپ نے فرمایا: اگر چہ اس نے زنا کیا، اگر چہ اس نے چوری کی، ابوذر کی ناپسندیدگی کے باوجود۔ اور ابوذر جب بھی اس حدیث کو بیان کرتے تو اس کے ساتھ یہ بھی کہتے کہ ابوذر کی ناپسندیدگی کے باوجود۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 5827، صحیح مسلم، حدیث نمبر 94)

کلمۂ توحید کے اقرار سے مراد وہ اقرار ہے جو آدمی کی پوری شخصیت کا نمائندہ بن کر ظاہر ہو، جس میں آدمی کا پورا وجود شامل ہو۔ ایسے اقرار کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا فکری اور روحانی وجود مکمل طور پر توحید کی حقیقت میں ڈھل گیا ہے۔ یہی وہ ربانی انسان ہے جو آخرت میں جنت کا مستحق قرار پائے گا۔

حدیث میں و إن زنى و إن سرق (اگر چہ اس نے زنا کیا، اگر چہ اس نے چوری کی) کا لفظ ہے، نہ کہ و إن يزني و إن يسرق (اگر چہ وہ زنا کرتا رہے، اگر چہ وہ چوری کرتا رہے) کا لفظ۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی ایمان لانے کے بعد بھی مستقل طور پر زنا اور سرقہ میں مبتلا رہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اتفاقی طور پر وقتی سبب سے کبھی اس قسم کا گناہ سرزد ہو جائے۔ اور پھر اس پر غلطی کا شدید احساس طاری ہو اور پھر وہ توبہ اور گریۂ ندامت سے اپنے آپ کو پاک کر لے۔ اس حدیث میں خدا سے ڈرنے والے انسان کا ذکر ہے، اور جس انسان کے دل میں خدا کا ڈر سمایا ہو وہ اگر کبھی جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی گناہ کر لے تو اس کے بعد اتنی شدت کے ساتھ اس کے اوپر گناہ کا احساس طاری ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ پاک انسان بن جاتا ہے۔

26

عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ محمد اس کے بندہ اور اس کے رسول ہیں۔ اور یہ کہ عیسی

اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور وہ اس کی بندی کے بیٹے ہیں اور وہ اس کا کلمہ ہے جو اس نے مریم کی طرف القاء کیا۔ اور وہ اس کی طرف سے روح ہیں اور یہ کہ جنت اور جہنم حق ہے۔ اللہ ایسے آدمی کو جنت میں داخل کرے گا، اس عمل کے مطابق جس پر وہ تھا (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 3435، صحیح مسلم، حدیث نمبر 28)۔

ایمان دراصل معرفت کا نام ہے۔ یعنی آدمی کو خدائی حقیقتوں کی شعوری دریافت حاصل ہو۔ اور پھر وہ اس کو بھرپور طور پر اپنی زندگی میں شامل کرلے۔ ایسے ہی انسان کو آخرت کی ابدی جنتوں میں داخلہ ملے گا۔

27

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ میں نے کہا کہ اپنا ہاتھ بڑھائیے تاکہ میں آپ سے بیعت کروں۔ آپ نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا۔ مگر میں نے اپنا ہاتھ سمیٹ لیا۔ آپ نے کہا کہ اے عمرو، یہ کیا۔ میں نے کہا کہ میں شرط لگانا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: کیا شرط لگانا چاہتے ہو۔ میں نے کہا: یہ کہ مجھے بخش دیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ اے عمرو، کیا تم نہیں جانتے کہ اسلام پچھلے کیے کو ڈھا دیتا ہے۔ اور ہجرت اپنے سے پہلے کیے کو ڈھا دیتی ہے۔ اور حج اس سے پہلے کے کیے کو ڈھا دیتا ہے۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 121)

ایمان انسانی شخصیت میں مکمل تبدیلی کا نام ہے۔ حقیقی ایمان کے بعد کوئی آدمی اپنی شخصیت کے اعتبار سے وہ نہیں رہتا جو کہ وہ اس سے پہلے تھا۔ یہ تبدیلی اس کی پوری شخصیت میں ایک مثبت انقلاب کا باعث بن جاتی ہے۔ ایمان کے بعد انسان کی سوچ، اس کا بولنا، اور اس کا کردار سب ایک نئے رنگ میں رنگ جاتا ہے، یعنی اللہ کا رنگ۔ اس کے بعد انسان کے اندر ایک نئی شخصیت ایمرج (emerge) کرتی ہے۔ انسان کے ذہنی ارتقا میں بہت زیادہ اضافہ ہوجاتا ہے۔ اب اس کے اندر ایک تخلیقی شخصیت جاگتی ہے۔ اب اس کا ذکر رب العالمین کا ذکر بن جاتا ہے۔ اب اس کا شکر اعلیٰ شکر بن جاتا ہے — خدا کے یہاں بعد از ایمان حالت کا اعتبار ہے، نہ کہ قبل از ایمان حالت کا۔

دعا کی حقیقت

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ دعا کچھ مقرر الفاظ کی تکرار کا نام ہے۔ یعنی پراسرار نوعیت کے کچھ الفاظ ہیں، ان کو اگر صحیح تلفظ کے ساتھ انسان دہرالے تو ایسی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ دعا اسپرٹ کا نام ہے، جو دل کی گہرائیوں کے ساتھ بندے کی زبان سے نکلتی ہے۔ یہ دراصل اسپرٹ ہے، جو کسی دعا کو قابلِ قبول دعا بناتی ہے۔ دعا کے الفاظ داعی کی قلبی کیفیت کو بتاتے ہیں، وہ محض زبانی طور پر تلفظ کلمات کے ہم معنی نہیں۔

دعا انسان کے داخلی احساس کا لفظی اظہار ہے۔ دعا دراصل اس بات کا نام ہے کہ خدا کی کائنات میں وہ بالکل بے بس ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ انسان دریافت کرے کہ خدا قادر مطلق ہے، اور وہ عاجز مطلق۔ خدا سب کچھ ہے، اور وہ بے کچھ۔ اگر خدا نہ دے تو اس کو کوئی چیز ملنے والی نہیں۔ یعنی وہ خدا کے مقابلے میں اپنی حالتِ عجز کو دریافت کرے۔ اور یہ دریافت انسان کے لیے اس کے وجود کا حصہ بن جائے۔ جب بندہ کو یہ بات دریافت کے درجے میں معلوم ہوجائے کہ اس کو وہی مل سکتا ہے، جس چیز کو اس کا خدا اسے دینے پر راضی ہوجائے۔ اس وقت بندہ کے اندر ایک بے پناہ تڑپ پیدا ہوتی ہے، اور وہ اپنی زبان سے اپنے رب کو پکارنے لگتا ہے۔ اس کیفیت کے ساتھ اس کی زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں، اسی کا نام دعا ہے۔

ایک روایت کے مطابق، وہ دعا، دعا نہیں جو غفلت والے دل (قَلْبٍ غَافِلٍ لَاهٍ) سے مانگی جائے (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3479)۔ جس آدمی کا حال یہ ہو کہ وہ بظاہر زبان سے دعا کے الفاظ تو دہرائے۔ لیکن اس کا دل کہیں اور اٹکا ہوا ہو۔ دعا وہ ہے، جو سچی اسپرٹ کے ساتھ مانگی جائے، جس میں آدمی کی شخصیت اور دعا دونوں ایک دوسرے کے ترجمان بن گئے ہوں۔ آدمی کی شخصیت زبان حال سے انسان کی ترجمانی کرے، اور دعا زبان قال سے انسان کی ترجمانی کرے۔ دعا اس کی شخصیت ہو، اور اس کی شخصیت اس کی دعا۔

مکمل اسلام، ربانی اسلام

اگر آپ قرآن کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ قرآن میں كُونُوا رَبَّانِيِّينَ (3:79) تو آیا ہے، یعنی اللہ والے بنو۔ مگر نفذوا شرائع الاسلام (اسلامی شریعت کو امپوز کرو) کہیں نہیں آیا ہے۔ اسلام کا یہ تصور بلاشبہ قرآن وسنت میں ایک اجنبی تصور ہے۔ یعنی یہ کہ اسلام زندگی کا ایک مکمل نظام ہے، اور اہل اسلام کا فرض ہے کہ وہ اس کو زندگی کے ہر شعبہ حیات میں پوری طرح نافذ کریں۔ کسی پیغمبر نے دین کا یہ تصور پیش نہیں کیا، اور نہ کسی پیغمبر نے یہ کہا کہ میرا کام خدا کے دین کو زندگی کے تمام شعبوں میں کامل طور پر نافذ کرنا ہے۔ حالاں کہ تمام پیغمبروں کا اصل دین ایک تھا۔

آپ اس قسم کے کسی مسلم رہنما کی تحریر پڑھیے یا اس کی تقریر سنیے، تو لمبی تقریر اور لمبی تحریر کے باوجود ان کی باتوں میں اصل اسلام حذف ہوگا۔ اللہ سے محبت کی بات، اللہ سے خوف کی بات، آخرت کے مواخذہ کی بات، جنت کے شوق کی بات، ذاتی تزکیہ کی بات، دعوت الی اللہ کی بات، وغیرہ۔ اس قسم کی تمام باتیں ان کے طویل کلام میں حذف ہوں گی۔ البتہ ساری دھوم اس بات پر ہوگی کہ فلاں طاقت اسلام کی دشمن ہے، فلاں طاقت اسلام کے خلاف سازش کر رہی ہے، فلاں قوم کے اندر اسلاموفوبیا کا مزاج پیدا ہو گیا ہے، فلاں حکومت اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، وغیرہ۔

ایسا کیوں ہے کہ ان لوگوں کی باتوں میں مثبت اسلام غائب ہو جاتا ہے، اور دشمنان اسلام کے تذکرے کی دھوم ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریک کے لیے صحیح نقطۂ آغاز کو دریافت ہی نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ ایک ایسے مقام سے اپنے عمل کا آغاز کرتے ہیں جو اس دنیا میں کبھی اپنی منزل تک پہنچنے والا ہی نہیں۔

جب وہ اس بات کو اپنا نشانہ بناتے ہیں کہ اسلام کو مکمل نظریۂ حیات کے طور پر نافذ کرنا ہے۔ تو ان کو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی پولیٹکل اتھارٹی ہے جو ان کے کام میں مستقل رکاوٹ ہے۔ اس لیے وہ فوراً پولیٹکل اتھارٹی سے ٹکراؤ شروع کر دیتے ہیں تاکہ خود پولیٹکل سیٹ پر قبضہ کریں۔ کیوں کہ ان کے مفروضہ نظریے کے مطابق ان کو نظر آتا ہے کہ پولیٹکل سیٹ پر قبضہ کیے بغیر

وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر حکومت کا دستور انھیں اجازت دے کہ تم نان پولیٹکل میدان میں اپنا کام جاری رکھو، تو ان کو دکھائی دے گا کہ یہ تو ناقص اسلام ہے۔ ہم اپنے نظریے کے خلاف ناقص اسلام پر کیسے راضی ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان کا مفروضہ مکمل اسلام ان کو کبھی حاصل نہیں ہوتا، اور جو اسلام ان کو حاصل ہوتا ہے، وہ نامکمل دکھائی دیتا ہے۔

اگر دین کا یہ تصور درست ہو کہ دین ایک جامع نظام حیات کا نام ہے، اور دین کو زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ کرنا اہل دین کا مشن ہے تو یہ دین کا ایک ایسا تصور ہے جو سرے سے قابلِ عمل ہی نہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی اپنا مشن یہ بنائے کہ مجھے سورج کو مغرب سے نکالنا ہے، اور اس کو مشرق میں غروب کرنا ہے، تو ایسا مشن کبھی واقعہ نہیں بنے گا۔ یہی حال اس تصور دین کا ہے جس کو مکمل اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت آدم سے لے کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تک انسانی تاریخ میں پیغمبروں کی رہنمائی میں دینی تحریک کا تسلسل جاری رہا۔ مگر اس پوری مدت میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں میں کامل نظام کی حیثیت سے نافذ اور قائم ہو جائے۔ حتی کہ خاتم النبیین کے زمانے میں بھی نہیں۔ انبیاء اور انبیاء کے متبعین کی پوری تاریخ میں کوئی نہیں بتا سکتا ہے کہ اس قسم کا مفروضہ کامل نظام کبھی عملاً جاری و نافذ رہا ہے۔

عمر بن الخطاب (وفات 23 ہجری) اسلام کے دوسرے خلیفہ تھے۔ انھوں نے اپنے ایک خطاب میں کہا: إِنَّ آخِرَ مَا نَزَلَتْ آيَةُ الرِّبَا، وَإِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ - صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - قُبِضَ وَلَمْ يُفَسِّرْهَا لَنَا، فَدَعُوا الرِّبَا وَالرِّيبَةَ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 2276)۔ یعنی سب سے آخر میں جو آیت نازل ہوئی، وہ آیتِ ربا تھی۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، اور آپ نے ہمارے لیے اس کی تفسیر نہیں بیان کی۔ پس تم ربا بھی چھوڑ دو، اور جس میں ربا کا شبہ ہو، اس کو بھی چھوڑ دو۔

اس طرح کے دوسرے بہت سے احکام ہیں، جن میں ہم کو بنیادی اصول تو ملتا ہے، لیکن ہم کو ان کی تفصیل نہیں ملتی۔ مثلاً خلیفہ کے انتخاب کا کوئی ایک متعین قرآن و سنت میں موجود نہیں۔ ایسی حالت میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ دین اصلاً انفرادی پیروی کا موضوع ہے، نہ کہ اجتماعی نفاذ کا موضوع۔

اہل جنت

قرآن میں اہل جنت کے تین گروہوں کا ذکر اس طرح آیا ہے: فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّهِ ذَلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ (35:32)۔ یعنی پس ان میں سے کچھ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور ان میں سے کچھ بیچ کی چال پر ہیں۔ اور ان میں سے کچھ اللہ کی توفیق سے بھلائیوں میں سبقت کرنے والے ہیں۔ یہی سب سے بڑا فضل ہے۔

یہ تین درجات جنت کے لیے انسان کی کوششوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے جنت کے دروازے ہر ایک کے لیے کھول دیے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ جنت کے مختلف درجات ہیں۔ کیوں کہ دنیا میں لوگوں کی کوششیں مختلف سطح پر ہوتی ہیں (اللیل، 92:4)۔ یہ کوششیں وسیع تر تقسیم کے اعتبار سے تین درجات پر مشتمل ہیں۔ یہ درجات دراصل عمل کے اعتبار سے ہیں۔ یعنی جنت کے لیے عمل کی تین بنیادی سطحیں ہیں۔ اور یہ سطحیں اس اعتبار سے بنیں گی کہ کون کتنا زیادہ مواقع کو اویل (avail) کرے گا۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی (1730-1810ء) اس آیت کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں کہ ظالم لنفسہ وہ لوگ ہیں، جو عمل میں کوتاہی کرتے ہیں (مقصر فی العمل)۔ اور مُقْتَصِدٌ سے مراد وہ لوگ ہیں، جو ظاہر قرآن پر عمل کرتے ہیں، حقیقت تک ان کی رسائی نہیں ہوئی (یعمل علی ظاہر الکتاب و لا یفوز الی حقیقتہ)۔ اور سابق بالخیرات وہ ہیں، جن کی رسائی حقائق قرآن تک ہے، جو عمل بھی کرتے ہیں اور دوسروں کو تعلیم بھی دیتے اور ہدایت بھی کرتے ہیں (من ضم الی العمل التعلیم و الإرشاد) تفسیر مظہری، جلد 8، صفحہ 56۔

حقیقت یہ ہے کہ جنت کا شوق جنت کے حصول کے لیے کافی نہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی عملاً اس کی تیاری کرے۔ چوں کہ انسان اپنی کوششوں کے اعتبار سے مختلف درجات میں بٹا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اسی اعتبار سے آخرت میں اپنا مقام پائے گا۔

عمل کی دعوت

قرآن کی ایک آیت ہے، جس کو اکثر صلحائے امت نے سب سے زیادہ امید کی آیت بتایا ہے۔ اس آیت کے الفاظ یہ ہیں: قُلْ يَاعِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (39:53)۔ یعنی کہو کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بیشک اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، وہ بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔ قرآن کی اس آیت کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت میں عدم قنوط پر زور دیا گیا ہے، یعنی غلطی سے جو احساسِ خطا پیدا ہوتا ہے، اس کو عمل مزید کی طرف موڑ دو۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ انسان امید (hope) میں جئے، وہ ناامیدی سے دور رہے۔ یعنی بندے کا مسئلہ یہ ہے کہ اس سے خطا سرزد ہوئی ہے۔ لیکن رب کا معاملہ یہ ہے کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ بندہ مایوسی کا شکار نہ ہو، ورنہ وہ بےعملی کا شکار ہو جائے گا۔ اس کے برعکس، توبہ کا مطلب ہے نئے جذبہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ عمل کی کوشش کرنا۔

اس آیت کا سب سے زیادہ اطلاق موجودہ زمانے پر ہوتا ہے۔ موجودہ زمانے میں عمل کے مواقع بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ یعنی دورِ جدید میں پوری طرح عمل کی آزادی ہے۔ قدیم دور میں مذہبی جبر کی وجہ سے یہ موقع نہیں تھا۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے احساسِ خطا کو اس طرح موڑ دے کہ وہ مواقع عمل کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرے۔ وہ توبۂ نصوح کی اسپرٹ کو عمل نصوح کے لیے استعمال کرے۔ وہ اپنے احساسِ خطا کو عمل کثیر کے لیے استعمال کرے۔

قدیم زمانے میں انسان کے لیے صرف احساسِ خطا میں جینے کا موقع تھا۔ آج مواقع کی فراوانی کی بنا پر اس کے لیے یہ موقع پیدا ہو گیا ہے کہ وہ کثرتِ مواقع کو کثرتِ عمل کے لیے استعمال کرے۔ یعنی جو موقع آپ سے کھو گیا، اس کو بھلا کر جو موقع ابھی باقی ہے، اس کو زیادہ سے زیادہ اویل کرو۔

بڑھاپے کا تجربہ

عربی زبان میں ایک مقولہ ہے — بڑھاپا نوجوانی کا ختم ہوجانا نہیں ہے، بلکہ وہ ایک نئے مرحلے کی تیاری کے لیے موقع ہے (الشيخوخة ليست فقدان الشباب، وإنما مرحلة جديدة للفرصة)۔ بڑھاپے کا تجربہ خالق نے انسان کے لیے کیوں مقدر کیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان سے یہ مطلوب تھا کہ وہ تواضع (modesty) کی اہمیت کو سمجھے۔ انسان کے لیے ہر قسم کی ترقی ماڈسٹی کے ساتھ رکھ دی گئی ہے۔ مگر تاریخ کا تجربہ یہ ہے کہ انسان تعلیم وتربیت کے ذریعہ ماڈسٹی کی اہمیت کو دریافت نہیں کر پاتا۔ اس لیے خالق نے انسان کے لیے یہ مقدر کیا کہ وہ بڑھاپے کے پُرمشقت تجربہ سے گزرے، اور غور وفکر کے ذریعے ماڈسٹی کی حکمت کو دریافت کرے۔

زمین کی کشش (gravitational pull) ایک عجیب نعمت ہے۔ کشش کے نظام کے بغیر زمین پر انسان کی زندگی کا فروغ ممکن ہی نہ ہوتا۔ اس لیے خدا نے نیوٹن (1642-1727ء) کے واسطے سے انسان کے لیے ایپل شاک (apple shock) کا تجربہ مقدر کیا۔ تاکہ انسان زمین کی قوت کشش کو دریافت کرے، اور اللہ کی رحمت سے باخبر ہو کر اللہ کا شکر گزار بندہ بنے۔ اسی مصلحت کے تحت خالق نے انسان کے لیے بڑھاپے کا دور مقدر کیا۔ بڑھاپا انسان کے لیے گویا ایپل شاک ہے۔

انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ شاک کے بغیر گہری باتوں کو پکڑ نہیں پاتا۔ بڑھاپا انسان کے لیے زندگی کی حقیقت کو پکڑنے کا آخری دور ہے۔ یعنی اللہ تعالی نے بڑھاپے کے طور پر انسان کو سچائی کی دریافت کا آخری موقع عطا کیا ہے۔ تاکہ پُرمشقت تجربہ کے ذریعہ انسان کے اندر سوچ جاگے، اور انسان اپنی زندگی کو زیادہ درست انداز میں منظم کرے۔ بڑھاپا انسان کے لیے گویا توبہ اور اصلاح کا دور ہے۔ بڑھاپا اس لیے ہے کہ انسان اپنے آخری زمانے میں اس حکمت کو دریافت کرے، جس سے وہ اپنے ابتدائی دور میں بے خبر رہا ہے۔ بڑھاپا سادہ معنی میں نوجوانی کا ختم ہوجانا نہیں ہے، بلکہ ایک نیا مرحلہ ہے۔ زندگی کا آخری موقع جس میں انسان خدا کی اسکیم آف تھنگ کو جانے اور اس کے مطابق عمل کرے۔

چیلنج کی صورتِ حال

ایک حدیثِ رسول ان الفاظ میں آئی ہے: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: نِعْمَتَانِ مَغْبُونٌ فِيهِمَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ: الصِّحَّةُ وَالفَرَاغُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6412)۔ یعنی عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: دو نعمتیں ہیں جن میں بہت سے لوگ دھوکے میں رہتے ہیں — تندرستی اور فرصت۔

اس حدیث میں ایک قانونِ فطرت کو بیان کیا گیا ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسان جس کو چیلنج کی صورتِ حال کا سامنا نہ ہو وہ غفلت کا شکار ہوجاتا ہے۔ انسان کی زندگی میں جب آرام و راحت کی صورتِ حال پیش آجائے تو ایسا انسان جمود (stagnation) کا شکار ہوجاتا ہے۔ ایسا انسان فکری طور پر ڈل (dull) ہوجاتا ہے۔ اس کے برخلاف، جب انسان چیلنج کی صورتِ حال میں رہتا ہے تو اس کی سوئی ہوئی فطری صلاحیتیں بیدار رہتی ہیں۔ چیلنج کی حالت انسان کی تخلیقیت (creativity) کو بڑھاتی ہے۔ اس کی وجہ سے ایک عام انسان سپر انسان (superman) بن جاتا ہے۔ اس کے اندر ناموافق صورتِ حال کو مثبت طور پر مینج کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔ ایسا انسان ہر عسر کے اندر یسر تلاش کرلیتا ہے۔

برٹش مورخ آرنلڈ ٹائن بی (1889-1975ء) نے 12 جلدوں میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کا نام اسٹڈی آف ہسٹری (A Study of History) ہے۔ اس کتاب میں اس نے پوری دنیا کی 19 عظیم تہذیبوں کا جائزہ لیا ہے۔ اس جائزے میں اس نے بتایا ہے کہ تاریخ میں فطرت کا ایک نظام قائم ہے۔ جس کو اس نے چیلنج- رسپانس میکینزم کا نام دیا ہے۔ یعنی حالات کے تحت ایک چیلنج پیش آتا ہے۔ اس کے بعد قوم کے اندر ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہلچل اس قوم کو ترقی کی طرف لے جاتی ہے۔ یہاں تک کہ غیر ترقی یافتہ قوم ترقی یافتہ قوم بن جاتی ہے۔ یہ عمل پوری تاریخ میں جاری رہا ہے۔ یہ معاملہ قوم کا بھی ہے، اور فرد کا بھی۔

اس کو راقم الحروف کے ایک تجربے سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک صاحب نے مجھ سے ایک بار

کہا کہ محمد کو اگر تاریخ سے نکال دیا جائے تو تاریخ میں کیا کمی رہ جائے گی۔ اس کو میں نے مثبت چیلنج کے طور پر لیا۔ اس طرح مجھے یہ موقع ملا کہ میں وہ کتاب لکھوں جس کا نام اسلام دورِ جدید کا خالق ہے۔

اسی طرح ایک مثال یہ بھی ہے کہ میرے پاس ایک نوجوان عالم دین رہتے تھے۔ ان کی ایک اہم صفت یہ تھی کہ وہ میرے اوپر خوب تنقیدیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے جاب کے لیے یو اے ای (UAE) چلے گئے۔ وہاں انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا: انا ناقد اکبر ناقدٍ في الهند (میں ہندستان کے سب سے بڑے ناقد پر نقد کرنے والا ہوں)۔ ان کی تنقیدوں سے میرے ذہن کے بند گوشے کھلتے تھے، نئی نئی باتیں ذہن میں آتی تھیں، وغیرہ۔

چیلنج کی صورتِ حال انسانی نیچر کے مطابق ہے۔ اس کے برعکس، آرام وراحت کا راستہ انسان کی نیچر کے مطابق نہیں ہے۔ میں ایک مرتبہ احمد آباد کے سفر میں ایک فیکٹری دیکھنے گیا۔ نئی امپورٹڈ مشینیں اس فیکٹری میں لگی ہوئی تھیں۔ فیکٹری کے نوجوان مالک نے بات چیت کے دوران ایک جملہ بولا تھا: اپنی تو لیمیٹشن (limitation) آجاتی ہیں مینجمنٹ سائڈ پر۔ اس جملے نے میرے مائنڈ کو ٹریگر کیا۔ میں نے سوچا کہ اسی طرح ہر انسان کے لیے اس کی ترقی کی لیمیٹشن (limitation) آجاتی ہے، جب اس کے لیے چیلنج کا ماحول باقی نہ رہے۔

کسی انسان کی زندگی میں چیلنج کا ماحول کیسے پیدا ہوتا ہے۔ جو انسان دو صفتوں یعنی کامل سادگی اور مکمل قناعت کا حامل ہو، اس کی زندگی میں یہ انقلاب آتا ہے۔ مکمل سادگی کامل عزم کی علامت ہے۔ یہ ایک بامقصد زندگی کی علامت ہے۔ عدم قناعت اس بات کی علامت ہے کہ آپ کے اندر گہرائی کا فقدان ہے، اور قناعت اس بات کی علامت ہے کہ آدمی گہری غور وفکر کا مالک ہے۔ اس بنا پر وہ مادی چیزوں کے بجائے معنوی چیزوں کو پسند کرتا ہے۔ اس کو پانے کا طریقہ ایک حدیث رسول میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ (جامع الترمذی، حدیث نمبر 2317)۔ یعنی یہ کسی آدمی کے اچھے اسلام میں سے ہے کہ وہ بے فائدہ چیز کو ترک کرے۔ دوسرے الفاظ میں، وہ غیر متعلق چیزوں کو ترک کردے تاکہ وہ سادہ زندگی، اونچی سوچ کا طریقہ اختیار کرسکے۔

بائی ٹائم اسٹریٹجی

ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ: إِنَّ أَفْضَلَ الْعِبَادَةِ انْتِظَارُ الْفَرَجِ مِنَ اللّٰہِ (مسند البزار، حدیث نمبر 6297)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: بے شک افضل عبادت اللہ کی جانب سے کشادگی کا انتظار کرنا ہے۔ ایک شارح نے اس حدیث کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے: بترك الشِّكاية من البلاء النازل (شرح مصابیح السنۃ لابن الملک، حدیث نمبر 1602)۔ یعنی نازل شدہ مصیبت کے موقع پر شکایت کو ترک کرنا۔

موجودہ زمانے میں ایک اسٹریٹجی وجود میں آئی ہے۔ اس کو بائنگ ٹائم (buying time) کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی کام کے لیے وقتی طور پر تاخیر کرنا تاکہ اپنی پوزیشن کو ٹھیک کیا جاسکے:

to delay an event temporarily so as to have a longer time to improve one's own position.

اس کا مطلب ہے وہی کام کرنا، جو آپ کے لیے ممکن ہو۔ زندگی میں جذباتیت کو ترک کرکے حقیقت پسند بننا۔ اگر انتظار کی ضرورت ہو تو جلد بازی کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے انتظار کرنا اور صبر سے کام لینا۔ حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ نے قریش مکہ کے ساتھ یک طرفہ شرطوں پر صلح کرلیا تھا۔ یہ جدید اصطلاح کے مطابق بائی ٹائم اسٹریٹجی تھی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر بائی ٹائم اسٹریٹجی کا اشارہ قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے: فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا (48:27)۔ یعنی پس اللہ نے وہ بات جانی جو تم نے نہیں جانی۔ مفسر البیضاوی (وفات 1292ء) نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے: من الحكمة في تأخير ذلك (تفسیر البیضاوی، جلد 5، صفحہ 131)۔ یعنی اس تاخیر میں جو حکمت ہے۔

اس صلح کے ذریعہ قریش سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ طے پایا اور نتیجۃً دعوت الی اللہ کے لیے موافق فضا پیدا ہوئی۔ اس صلح کے ذریعہ آپ نے اپنے لیے تیاری کا موقع حاصل کیا، اور اتنی زیادہ تیاری کرلی کہ کسی جنگ کے بغیر آپ کو فریق ثانی کے مقابلے میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ اسی لیے اس صلح کو قرآن میں فتح مبین کہا گیا ہے۔ یعنی ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کیے بغیر بائی ٹائم اسٹریٹجی کے ذریعے مخالفین کے اوپر غلبہ حاصل کرنا۔

بات کرنے کا طریقہ

گفتگو کرنے کا ایک صحیح طریقہ ہے، اور ایک بے فائدہ طریقہ۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ کی بات سن کر سننے والے کو اس سے کوئی ٹیک اوے (takeaway) ملے، یعنی کوئی واضح بات جس کو لے کر وہ آپ کی مجلس سے اپنے گھر جائے۔ ایسی گفتگو صحیح گفتگو ہے۔ یعنی جب سننے والے سے پوچھا جائے کہ تمھارے لیے اس کا ٹیک اوے کیا تھا۔ اس کے جواب میں اگر سننے والے نے آپ کی گفتگو سے کوئی نئی بات پائی ہو، اور وہ کوئی واضح اور متعین بات کہتا ہے تو آپ کی گفتگو کا طریقہ صحیح تھا۔ ٹیک اوے کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں آپ کو ذہنی غذا (intellectual food) ملتی ہے۔

اس کے برعکس، اگر ایسا ہو کہ آپ نے لمبی بات کہی یا لمبی تقریر کی۔ لیکن جب سننے والے سے پوچھا جائے کہ تمھیں اس بات یا تقریر سے کیا ٹیک اوے ملا۔ اور وہ اس کا کوئی واضح جواب نہ دے سکے تو ایسی گفتگو کا نہ سننے والے کو کوئی فائدہ، اور نہ بولنے والے کو۔

صحیح گفتگو وہ ہے، جس سے سننے والے کو ٹیک اوے ملے۔ جس کو سن کر آدمی کا ذہن کھلے، جس کو سن کر آدمی کو کوئی واضح پوائنٹ حاصل ہو، جس کو سن کر آدمی جب لوٹے تو ایک متعین بات سمجھ میں آئی ہو۔ اس کوئی نئی بات دریافت ہوئی ہو۔ صحیح گفتگو وہ ہے جو کہنے والے کی طرف سے سوچ سمجھ کر کہنے کے ہم معنی ہو، اور سننے والے کے لیے وہ کسی نئی بات کی دریافت بن جائے۔ جس گفتگو میں یہ صفت نہ پائی جائے، وہ لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِنْ نَجْوَاهُمْ (4:114) کا مصداق ہے۔ یعنی ان کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں۔

جن لوگوں کے اندر سنجیدگی نہ پائی جاتی ہو وہ الفاظ بولتے ہیں، لیکن ان کے الفاظ گہری معنویت سے خالی ہوتے ہیں۔ ان کے کلام میں وضوح (clarity) نہیں ہوتا۔ ایسے کلام سے لوگوں کو کوئی ٹیک اوے (takeaway) نہیں ملتا۔ سچا انسان وہ ہے، جو کسی سے گفتگو کے وقت یہ محسوس کرے کہ اس کی گفتگو زیادہ مؤثر گفتگو نہیں ہے، وہ بے فائدہ کلام ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ بے فائدہ بحث ومباحثہ سے اپنے آپ کو بچائے۔ وہ لایعنی باتوں سے پرہیز کرے، اور اپنے آپ کو غور وفکر میں لگائے۔

ڈائری 1986

27 جنوری 1986

پروفیسر علی اشرف (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا: میں ہر مہینہ باقاعدہ الرسالہ پڑھتا ہوں۔ اس سے پہلے 1980ء میں آپ کی تمام کتابیں خرید کر پڑھ چکا ہوں۔ بعض کتابیں ایک سے زیادہ بار بھی پڑھی ہیں۔

انہوں نے کہا کہ آپ نے اپنی تحریروں میں جو فکر پیش کیا ہے اس سے مجھے صد فی صد اتفاق ہے۔ اب تک کے مطالعے میں مجھے آپ کی صرف ایک بات کھٹکی ہے اور وہ آپ کا وہ مضمون ہے، جس کا عنوان ہے: حسنین: تاریخ کے دو علامتی کردار (ظہور اسلام، صفحہ 90)۔

اس مضمون کو پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا گویا آپ یہ تلقین کر رہے ہیں کہ انسان کو برائی (evil) کے مقابلے میں کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ اس کو برائی کے مقابلے میں اپنا سر جھکا کر بیٹھ جانا چاہیے۔

میں نے کہا کہ مجھے برائی کے خلاف اقدام کرنے پر اعتراض نہیں ہے بلکہ ایسے اقدام پر اعتراض ہے جب کہ اقدام سے نقصان ہو جائے مگر برائی وہیں کی وہیں باقی رہے۔

میں نے کہا کہ میرا اختلاف برائی کے خلاف اقدام سے نہیں ہے بلکہ میرا اختلاف ایسا اقدام سے ہے جو نتیجہ خیز ہونے والا نہ ہو۔ قبل از وقت اقدام یا تیاری کے بغیر اقدام ہمیشہ بے فائدہ ہوتا ہے۔ اور اقدام کی یہی وہ قسم ہے جس سے مجھے اختلاف ہے۔ برائی کے خلاف عملی اقدام صرف اس وقت کرنا چاہیے جب کہ اقدام کے ضروری اسباب فراہم ہو گئے ہوں۔ بصورتِ دیگر برائی کے خلاف نصیحت اور تلقین کی سطح پر کام کیا جانا چاہیے، نہ کہ عملی اقدام کی سطح پر۔

پروفیسر علی اشرف صاحب نے میری اس وضاحت سے اتفاق کیا۔

28 جنوری 1986

مسز شکیلہ خاں (پیدائش 1940ء) 1980 سے الرسالہ پڑھتی ہیں، اور اس کے ساتھ ان کے

شوہر آر یو خان بھی۔ انہوں نے کہا کہ میں الرسالہ کے کئی پرچے منگاتی ہوں اور ان کو دوسروں تک پہنچاتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ الرسالہ بہت اچھی چیز ہے، مگر کبھی بہت اچھی چیز بھی لوگوں کو اچھی دکھائی نہیں دیتی۔

انہوں نے کہا کہ آپ کی یہ بات مجھے بہت پسند ہے کہ گنبد کھڑا کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ کچھ اینٹیں اس کی نیو میں دفن ہونے پر راضی ہوں۔ انہوں نے اپنے بارے میں تاثر کے ساتھ کہا کہ ''میں وہ نیو (foundation) بننا چاہتی ہوں جس پر کوئی گنبد کھڑا ہو سکے''۔

انہوں نے اپنے شوہر کے بارے میں بتایا کہ وہ بہت حقیقت پسند (realist) ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے گھر میں ایک مسئلہ پیدا ہوا۔ میں بہت جھنجھلائی۔ میرے شوہر نے سمجھایا کہ اس وقت ہم صرف صبر ہی کر سکتے ہیں۔ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ بعد کو ہو سکتا ہے۔ ان کا یہ جملہ مجھے بہت پسند آیا کہ ''بعد کو سب کچھ ہوگا مگر اس وقت کچھ نہیں ہو سکتا''۔ اسی طرح ایک بار وہ اپنے ایک رشتے دار کے یہاں گئیں۔ وہاں انہیں کچھ دن ٹھہرنا تھا۔ وہاں لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقے انہیں غلط نظر آئے۔ اس پر انہیں غصہ آیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ لوگوں سے لڑ جائیں۔ ان کے شوہر نے کہا کہ یہ تمہارا گھر نہیں ہے، یہ دوسرے کا گھر ہے۔ یہاں تم کو برداشت کر کے رہنا ہوگا۔ اس گھر میں کچھ نہیں بدلے گا، اگر بدلوگی تو تم بدلوگی۔ اسی طرح انہوں نے اپنے شوہر کی ایک بات ان الفاظ میں نقل کی: ''اگر اپنی غلطی کو درست ثابت (justify) کروگی تو کبھی ترقی نہیں کروگی۔ ترقی کرنے کے لیے اپنی غلطی کو ماننا پڑتا ہے''۔

29 جنوری 1986

27 جنوری 1986 کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (تغلق آباد) میں مسٹر اصغر علی انجینئر کی ایک تقریر تھی۔ اس کا عنوان تھا:

Islam and Contemprorary Problems

مسٹر اصغر علی انجینئر ان لوگوں میں سے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں حالات بدل گئے

ہیں، اس لیے اسلام کی ازسرنو تعبیر (بالفاظ دیگر نظر ثانی) ہونی چاہیے۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن منزل (goal) کی بات نہیں کرتا بلکہ صراط کی بات کرتا ہے۔ صراط کا مطلب ان کے نزدیک پراسس ہے۔ گویا اسلام میں کوئی حکم آخری طور پر طے شدہ نہیں ہے۔ مگر انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ صراط کے معنی پراسس کیسے ہیں۔ انہوں نے اس کی کوئی لغوی دلیل نہیں دی۔ حالانکہ دلیل کے بغیر مجرد بیان کی کوئی اہمیت نہیں۔

ایک گھنٹے کی تقریر میں انہوں نے کوئی ایک بھی ایسی واضح مثال نہیں دی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ حالات میں ایسا فرق ہو گیا ہے کہ اب اسلامی حکم میں تبدیلی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

انہوں نے کہا کہ مسلم معاشرہ میں عورتوں کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ اس لیے ضروری ہو گیا ہے کہ اسلام کے نکاح وطلاق کے قانون پر نظر ثانی کی جائے۔ انہوں نے اس سلسلے میں اسلام میں فری انکوائری کے اصول کو رائج کرنے پر زور دیا۔ یہ ایک بڑا عجیب تضاد ہے۔ مقرر موصوف نے جو مثال پیش کی اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلم معاشرہ میں عمل (practice) غیر اسلامی ہو گیا ہے۔ مگر اس کی بنیاد پر وہ اسلام کے اصولوں کے بارے میں فری انکوائری کی وکالت کر رہے ہیں۔ جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ موجودہ معاشرتی خرابی اصول پر عدم پابندی سے ہوئی ہے۔ تو فری انکوائری اس بات پر ہونی چاہیے کہ اصول اور عمل میں مطابقت کیسے پیدا کی جائے، نہ یہ کہ اصولوں پر فری انکوائری کا عمل کیا جائے۔

30 جنوری 1986

آج اتفاقاً لال قلعہ (دہلی) کی طرف جانا ہوا۔ اس عظیم قلعہ کو پانچویں مغل حکمراں شاہ جہاں (1592-1666ء) نے بنوایا تھا۔ قلعہ کی وسیع عمارتیں اور 75 فٹ اونچی دیواریں سرخ پتھروں سے بنی ہوئی ہیں۔ ان کو دیکھ کر عجیب تاثر قائم ہوتا ہے۔

تین سو سال پہلے یہ قلعہ دنیا کی ایک طاقتور سلطنت کا مرکز تھا۔ ''سلطان دہلی کو اس وقت کتنی بڑی حیثیت حاصل ہوگی'' لال قلعہ کو دیکھ کر میری زبان سے یہی جملہ نکلا۔ مگر عجیب بات ہے کہ

لال قلعہ بننے کے بعد ہی مغل سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔ اس کی وجہ افراد کی کمی تھی۔ مغل حکمرانوں کے پاس پتھر کافی مقدار میں تھے، جن سے وہ ایک عظیم قلعہ بنا سکیں، مگر ان کے پاس جاندار افراد نہ تھے جن سے وہ ایک عظیم سیاسی نظام بنا سکیں۔

اس کے بعد شاہی خاندان میں اقتدار کی لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ شاہی افراد ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ صوبائی حاکموں میں مرکز سے بغاوت کا رجحان پیدا ہوگیا۔ اس صورت حال سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا۔ وہ دھیرے دھیرے پورے ملک پر قابض ہوگئے۔

لال قلعہ کو دیکھ کر یہ سب باتیں ذہن میں تازہ ہوگئیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا: قوم کے افراد میں اگر جان نہ ہو تو پتھروں کی دیواریں قوم کو بچانے والی ثابت نہیں ہوتیں۔ جس قلعہ کو مغل حکمرانوں نے اپنے ابدی اقتدار کی علامت سمجھا تھا وہ ان کے اقتدار کا قبرستان بن کر رہ گیا— طاقت کا اصل راز جاندار افراد ہیں اور یہی وہ متاع ہے جو دنیا میں ہمیشہ سب سے کم پائی گئی ہے۔

31 جنوری 1986

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ قرآن کی آیتوں پر غور کرو۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کا ایک حصہ سطور (lines) میں ہے اور اسی کا دوسرا حصہ بین السطور (between the lines) میں۔ اس بین السطور والے قرآن کو صرف غور کرکے پایا جا سکتا ہے۔ اگر قرآن کا ایک حصہ غیر ملفوظ طور پر اس کے بین السطور میں نہ ہوتا تو قرآن پر غور کرنے کا حکم نہ دیا جاتا۔

مجھ پر ایک تجربہ گزرا۔ یہ تجربہ ایک مثال ہے جو اس معاملے کو واضح کر رہا ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے دو قسم کے پانی بنائے۔ ایک میٹھا اور دوسرا کھاری (فاطر، 35:12)۔ اسی طرح قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ زمین میں مختلف پھل پیدا ہوتے ہیں۔ سب کو ایک پانی سے سیراب کیا جاتا ہے۔ مگر سب برابر نہیں۔ ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل ہے (الرعد، 13:4)۔

ان آیتوں پر غور کرتے ہوئے اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ان میں ایک ایسا مفہوم پا رہا ہوں جو لفظوں میں لکھا ہوا نہیں۔ یعنی اللہ کی ایک نئی صفت۔ میرے ذہن میں آیا کہ انسان کسی

چیز کے مزے کو چکھ کر جانتا ہے۔ آدمی اگر چیز کو زبان سے نہ چکھے تو وہ اس کے مزے کو نہ جان سکے۔ خدا کھانے پینے سے ماورا ہے۔ خدا نے کبھی کسی چیز کو نہیں چکھا۔ پھر اس کو چیزوں کا مزا کیسے معلوم ہوا۔ یہ غور کرتے ہوئے اچانک مجھ پر خدا کی ایک نئی صفت منکشف ہوئی۔ یہ صفت کہ وہ چکھے بغیر چیزوں کے مزے کو جانتا ہے۔ خدا اس انوکھی طاقت کا مالک ہے کہ وہ چیزوں کو انسان کی طرح زبان سے نہ چکھے، اس کے باوجود وہ پوری طرح جانے کہ کس چیز کا مزہ کیا ہے اور کس چیز کا مزہ کیا۔

1 فروری 1986

3 ستمبر 1984 کو مسٹر مسعود احمد بنارسی سے میری ایک گفتگو ہوئی تھی۔ گفتگو کا موضوع سکھوں کا آزاد صوبہ (پنجابی صوبہ) تھا۔ میں نے کہا کہ آزاد پنجابی صوبہ کبھی نہیں بنے گا۔ انہوں نے اس سے سخت اختلاف کیا۔ انہوں نے کہا کہ تین سال میں سکھوں کا آزاد پنجابی صوبہ ضرور بن جائے گا۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر میرا یہ اندازہ صحیح نہیں نکلا تو میں آپ کو ایک لاکھ روپے ادا کروں گا۔ انہوں نے اپنے قلم سے میری ڈائری میں یہ الفاظ لکھے:

Within three years Punjab will have an independent Khalistan. Bet Rs. one lakh.

آج ہندوستان ٹائمس (1 فروری 1986) میں، میں نے مسٹر خشونت سنگھ کا ایک مضمون پڑھا۔ اس مضمون کو پڑھ کر مجھے وہ واقعہ یاد آیا جو اوپر نقل کیا گیا ہے۔ مسٹر خشونت سنگھ کے مضمون کا عنوان ہے: بیوقوفوں کی ایک قوم (A Nation of Fools)۔ اس مضمون میں مسٹر خشونت سنگھ نے اس پوری سیاست کو احمقانہ سیاست بتایا ہے۔ انہوں نے پنجاب کی تازہ سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

I disapprove of their actions. This is no kar seva but kursee-seva. (Gurcharan Singh) Tohra (d. 2004) wants to stick to his kursee, they want it for themselves.

انہوں نے پنجاب کی سیاست پر اردو کا حسب ذیل شعر چسپاں کیا ہے:

جنوں کا دور ہے کس کس کو جائیں سمجھانے ادھر بھی عقل کے دشمن، ادھر بھی دیوانے

3فروری1986

آج کانپور کے دوصاحبان ملنے کے لیے آئے۔ایک ندوی عالم تھے اور دوسرے تاجر تھے۔ وہ دونوں تبلیغی جماعت کے چلہ میں گجرات جارہے ہیں۔

گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ اس وقت امت میں دوقسم کے کام چل رہے ہیں۔ایک اصلاحی اور دوسرا مطالباتی۔ پہلے کو داخلی انداز کار اور دوسرے کو خارجی انداز کار کہہ سکتے ہیں۔قرآن وسنت سے جہاں تک میں سمجھا ہوں،صرف داخلی انداز کار ہی صحیح انداز کار ہے۔خارجی انداز کار کی تصدیق قرآن نہیں کرتا۔

پھر میں نے کہا کہ داخلی انداز کار کا اصول اگر مسلمانوں کی کسی جماعت میں پایا جاتا ہے تو وہ صرف تبلیغی جماعت ہے۔تبلیغی جماعت، احتجاج اور مقابلہ اور تجاویز کا طریقہ اختیار نہیں کرتی جو موجودہ زمانہ میں دوسری مسلم جماعتیں اختیار کیے ہوئے ہیں۔وہ تمام تر مسلمانوں کی داخلی اصلاح پر زور دیتی ہے۔اور داخلی اصلاح ہی بلاشبہ اصل قرآنی کام ہے۔

میں نے کہا کہ مستقبل میں اگر کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے تو صرف داخلی انداز کار سے نکل سکتا ہے۔خارجی انداز کار سے قطعاً کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں۔خواہ اس قسم کی تحریکیں ایک ہزار سال تک چلتی رہیں۔

4فروری1986

دومسلم نوجوان مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔انہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ ایس آئی ایم آئی (SIMI) سے تعلق رکھتے ہیں۔پھر انہوں نے کہا کہ ہندوستان کے مسلم مسائل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے کہا کہ کون سے مسلم مسائل؟ انہوں نے کہا کہ مثلاً یہ کہ:

''ہندوستان کی کورٹ ہمارے شرعی قانون کو چیلنج کرنا چاہتی ہے''

میں نے کہا کہ آپ کے اس جملے میں دوغلطیاں ہیں۔آپ کورٹ کے بارے میں فرمارہے ہیں کہ وہ شرعی قانون کو بدلنا چاہتی ہے۔حالانکہ کورٹ کا یہ کام ہی نہیں۔قانون کو بدلنا قانون ساز

اسمبلی کا کام ہے، نہ کہ کورٹ کا۔ کورٹ تو صرف اس لیے ہوتی ہے کہ وہ بنے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ دے۔ وہ قانون کو منطبق کرنے کے لئے ہوتی ہے، نہ کہ حقیقتاً قانون کو بنانے کے لیے۔

دوسری بات یہ کہ عدالت کا کوئی اقدامی رول نہیں ہوتا۔ یعنی وہ خود سے آ کر آپ کے اوپر کوئی قانون نافذ نہیں کرتی۔ آپ جب اس کے یہاں جا کر کہتے ہیں کہ فلاں قانون کے مطابق میرے معاملے کا فیصلہ کرو تو وہ شہادتوں کو سننے کے بعد متعلقہ قانون کو آپ کے معاملے پر منطبق کر دیتی ہے۔

مثال کے طور پر شاہ بانو کے کیس میں خود مذکورہ مسلم خاتون نے عدالت سے کہا کہ میرے معاملے میں کریمنل پروسیجر کوڈ کی دفعہ 125 کے مطابق فیصلہ دیا جائے تو اس نے فیصلہ دیا۔ اس کے برعکس، اگر مسلم خاتون یہ دعوی کرتی کہ میرے معاملے میں مسلم شرعی قانون کے مطابق فیصلہ دیا جائے تو کورٹ مسلم پرسنل لا کے مطابق فیصلہ دیتی۔ اس معاملے میں واضح طور پر مسئلہ کسی کورٹ کی طرف سے نہیں پیدا ہوا ہے بلکہ خود مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہوا ہے جو اپنے معاملات کا فیصلہ ملکی قانون کے تحت کرانا چاہتے ہیں۔

5 فروری 1986

نظام الدین (نئی دہلی) میں ہمارے دفتر سے ملا ہوا ایک پارک ہے۔ اس پارک میں ایک لمبا سیمل کا درخت (silk-cotton tree) ہے۔ اس درخت کی شاخیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ اس میں روزانہ رات کو گدھ آ کر بیٹھتے تھے۔ لوگوں نے پٹاخہ چھوڑ کر ان کو بھگانے کی کوشش کی، مگر وہ نہیں بھاگے۔ آخر کار کارپوریشن نے اس کا حل یہ نکالا کہ درخت کی تمام شاخیں کاٹ دی گئیں۔

یہ واقعہ 1985ء کے آغاز میں ہوا۔ شاخیں کاٹنے کے بعد درخت کا منظر یہ تھا۔ تاڑ کی مانند ایک لمبا خالی تنا فضا میں کھڑا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ البتہ کاٹنے والوں نے یہ کیا کہ بالکل اوپر ایک آخری شاخ چھوڑ دی۔ یہ شاخ تقریباً دو میٹر لمبی تھی۔

اب اس درخت کے کٹنے پر ایک سال پورا ہو چکا ہے۔ آج اس بظاہر خشک تنے کا منظر

دوسرا ہے۔قدیم شاخوں کے کٹنے کے بعد نیچے سے اوپر تک تنے کے چاروں طرف نئی شاخیں اور پتیاں نکلیں، یہاں تک کہ وہ ان سے ڈھک گیا۔اب وہ خشک تنا نہیں بلکہ وہ ایک پورا درخت ہے جو سرسبز وشاداب حالت میں کھڑا ہوا ہے۔تاہم اس شادابی میں ایک استثنا ہے اور وہ اسی شاخ کا ہے جس کو کاٹنے والے نے چھوڑ دیا تھا۔یہ شاخ آج بھی ٹھیک ویسی ہی ہے جیسی ایک سال پہلے تھی۔ایک پتلی سی لکڑی اور اس کے اوپر چند سوکھی پتیاں۔درخت کی نئی شاخیں خوب سرسبز وشاداب نظر آتی ہیں، مگر یہ قدیم شاخ ایک مرجھائی ہوئی موٹی ٹہنی کا منظر پیش کرتی ہے۔

یہ قدرت کا ایک سبق ہے۔اس دنیا میں جس کو کاٹا جائے وہی دوبارہ ظہور کرتا ہے۔جس کی سرسبزی کو مٹایا جائے وہی زیادہ سرسبز وشاداب ہو کر زمین کے اوپر کھڑا ہوتا ہے۔یہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں نہیں میں ہے کا امکان ہے۔جہاں موت کے اندر زندگی کا راز چھپا ہوا ہے۔

6فروری1986

ڈاکٹر شعیب احمد قاسمی (پرنسپل طیبہ کالج جے پور) ملاقات کے لیے تشریف لائے۔انہوں نے بتایا کہ جے پور میں ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے۔اس کا ایک جلسہ ہوا اور اس کی صدارت کے لیے ہندوستان کے ایک مشہور ترین عالم کو بلایا گیا۔

اس جلسہ میں ادارہ کے ذمہ دار نے اپنی تقریر میں بتایا کہ ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ دوسرے کورسوں کے علاوہ ٹیکنیکل کورس بھی رکھیں اور اس کے ذریعے ٹیکنیشین (technicians) تیار کریں۔مذکورہ عالم تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہاں ٹیکنیشین (technicians) کی نہیں بلکہ اکسپرٹ (experts) کی ضرورت ہے۔ڈاکٹر شعیب نے بتایا کہ مولانا کی یہ تقریر بہت پسند کی گئی۔

میں نے کہا کہ یہ محض ایک خطابت ہے۔یہ کوئی گہری بات نہیں۔حضرت عمر اور حضرت علی دونوں جلیل القدر صحابی تھے۔مگر حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں معاملات درست تھے اور حضرت علی کی خلافت کے زمانے میں معاملات بگڑ گئے۔کسی نے حضرت علی سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے؟

حضرت علی نے جواب دیا: ''عمر کے ساتھی میرے جیسے لوگ تھے، میرے ساتھی تمہارے جیسے لوگ ہیں'' (تاریخ ابن خلدون، جلد 1، صفحہ 264)۔ باالفاظ دیگر عمر کے زمانہ میں ''اکسپرٹ'' کے ساتھ ''ٹیکنیشین'' بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ اب ''اکسپرٹ'' ہیں مگر ''ٹیکنیشین'' موجود نہیں۔ ایک اکسپرٹ کے تحت لاکھوں ٹیکنیشین درکار ہوتے ہیں تب ایک نظام چلتا ہے۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی بربادی کا سب سے بڑا سبب مذکورہ بالا قسم کی پرجوش تقریریں ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان یونیورسٹی بناتے ہیں، مگر وہ ابتدائی سطح پر جدید تعلیم کا انتظام نہیں کرتے۔ وہ خلافت اور حکومت قائم کرنے کے لیے دوڑتے ہیں، مگر معاشرہ تیار نہیں کرتے۔ عالمی انقلاب کی باتیں ان کو بہت پسند آتی ہیں، مگر افراد کے اندر انقلاب لانے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کا ہر آدمی ''گنبد'' کی اصطلاحوں میں سوچتا ہے، مگر ''بنیاد'' کی اصطلاحوں میں سوچنا انہیں کم تر درجہ کی بات معلوم ہوتی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کے ہوائی قلعے تو خوب بن رہے ہیں، مگر حقیقی قلعہ تعمیر کرنے میں وہ اب تک کامیاب نہ ہو سکے۔

7 فروری 1986

ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس کا عنوان تھا ''عمامہ اور اتباع سنت''۔ مضمون نگار نے محدث ابوبکر بیہقی (وفات 1066ء) کی شعب الایمان کے حوالے سے عمامہ کی فضیلت میں ایک روایت نقل کی ہے۔ پھر اطاعت رسول اور اتباع سنت کی اہمیت ثابت کرتے ہوئے عمامہ باندھنے پر زور دیا ہے۔

عمامہ باندھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً ثابت ہے۔ لیکن قولاً کوئی ایک بھی صحیح حدیث نہیں جس سے عمامہ پہننے کی اہمیت ثابت ہوتی ہو۔ عمامہ کی فضیلت میں جو بھی روایتیں ذخیرۂ حدیث میں موجود ہیں، وہ سب کی سب غیر ثابت شدہ ہیں، ایک بھی صحیح حدیث نہیں۔ سنن الترمذی کے شارح عبدالرحمن مبارکپوری لکھتے ہیں: لَمْ أَجِدْ فِي فَضْلِ الْعِمَامَةِ حَدِيثًا مَرْفُوعًا صَحِيحًا وَكُلُّ مَا جَاءَ فِيهِ فَهِيَ إِمَّا ضَعِيفَةٌ أَوْ مَوْضُوعَةٌ (تحفۃ الأحوذی للمبارکفوری، جلد 5، صفحہ 339)۔ یعنی، عمامہ کی فضیلت میں کوئی صحیح مرفوع حدیث مجھے نہیں ملی، اس تعلق سے جو حدیثیں بھی ہیں، وہ یا تو ضعیف ہیں یا موضوع۔

مثلاً ایک روایت یہ ہے: عَلَیْکُمْ بِالْعَمَائِمِ فَإِنَّهَا سِیمَاءُ الْمَلَائِکَةِ (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 13418)۔ یعنی، تم پر پگڑیاں پہننا لازم ہے، کیوں کہ یہ فرشتوں کی پہچان ہے۔ اس حدیث کا ایک راوی مجہول ہے (الحاوی للفتاوی للسیوطی، جلد 1، صفحہ 359) اور علامہ ابن طاہر پٹنی (وفات 1578ء) نے اس حدیث کو موضوعات میں شمار کیا ہے (تذکرۃ الموضوعات، صفحہ 155)۔ ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: الْعَمَائِمُ تِیجَانُ الْعَرَبِ (مسند الشہاب، حدیث نمبر 68)۔ یعنی، پگڑیاں عرب کا تاج ہیں۔ یہ روایت بھی باعتبار اسناد ضعیف ہے (المقاصد الحسنہ للسخاوی، حدیث نمبر 717)۔

یہ بات بطور واقعہ صحیح ہے کہ قدیم عرب میں پگڑی پہننا شرافت اور عزت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اُس دور میں پگڑی آدمی کی سنجیدگی اور وقار کا نشان تھی۔ اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے بھی پگڑی کا استعمال کیا۔ مگر میرا خیال ہے کہ عمامہ باندھنا عادت عرب ہے، نہ کہ سنتِ رسول، یہ تاج العرب ہے، نہ کہ تاج الاسلام۔

8 فروری 1986

شری ڈی این آول 6 فروری کو ہمارے دفتر میں آئے۔ وہ اس وقت دہلی میں اپنے لڑکے کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بات چیت کے دوران اندازہ ہوا کہ وہ اردو بخوبی جانتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کو اپنی نئی کتاب ''اللہ اکبر'' بطور تحفہ دی۔ تیسرے دن 8 فروری کو کتاب واپس آ گئی۔ میں نے سمجھا کہ شاید بغیر پڑھے ہوئے انہوں نے واپس بھیج دی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ان کا ایک خط بھی تھا۔ اپنے اس خط میں انہوں نے کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات بتاتے ہوئے نہایت بامعنیٰ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے لکھا تھا:

''آپ کی کتاب ''اللہ اکبر'' مجھے پرسوں عطا ہوئی تھی۔ میں اس کے مطالعہ میں اس قدر کھو گیا کہ آج صبح تک اس کو سارا پڑھ کر ہی دم لیا۔ یہ بھی قادر مطلق کی شان ہے، ورنہ 288 صفحات کی کتاب کو اتنی جلدی پڑھ لینا کوئی آسان کام نہ تھا''۔

یہ کتاب میں نے انہیں واپسی کی شرط پر نہیں دی تھی، تاہم انہوں نے کتاب کو بہت ہی

حفاظت کے ساتھ ورق کے اوپر کاغذ لگا کر پڑھا اور ویسے کا ویسا ہی واپس کر دیا۔

پچھلے برسوں میں، میں نے بہت سے مسلمانوں کو ہدیۃً یہ کتاب دی ہے۔ اور ان سے یہ کہا ہے کہ آپ اس کو پڑھنے کے بعد ایک خط میں اپنے تاثرات لکھ کر بھیج دیں۔ مگر جہاں تک یاد ہے غالباً کسی ایک مسلمان نے بھی اب تک ایسا خط نہیں بھیجا۔

اس طرح کے مختلف تجربات ہیں جن کی روشنی میں، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسلمان بالکل بے جان قوم ہو چکے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہندو ایک زندہ قوم ہیں۔ کاش اسلام کے خلاف تعصب کی دیواریں ڈھ جائیں اور وہ موجودہ دور میں خدا کے دین کے علم بردار بن سکیں۔

9 فروری 1986

آج تبلیغی جماعت کے کچھ لوگ ملنے کے لیے آئے۔ وہ بکارو اسٹیل (بہار) میں کام کرتے ہیں۔ ان میں ایک صاحب انجینئر تھے۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ ہمارا مشن اور تبلیغ کا مشن اصلاً ایک ہے۔ فرق یہ ہے کہ تبلیغ عوام (masses) کے لحاظ سے کام کرتی ہے اور ہم ذہین طبقہ (intellectual class) کے لحاظ سے کام کر رہے ہیں۔

انجینئر صاحب نے کہا کہ تبلیغی جماعت دونوں طبقہ کے لیے کام کر رہی ہے۔ مثلاً آپ دیکھیے کہ ہماری جماعت جو بکارو سے آئی ہے اس میں میرے سمیت چار انجینئر ہیں۔

یہ ایک زبردست غلط فہمی ہے۔ لوگ ڈگری ہولڈرس اور انٹیلکچولس کو ہم معنیٰ سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ ایسی بات کہتے ہیں۔ حالاں کہ یہ دونوں ہم معنیٰ الفاظ نہیں۔ انٹیلکچول سے مراد وہ شخص ہے جو غیر معمولی ذہین ہو اور مسائل پر زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچتا ہو۔ جب کہ ڈگری یافتہ ہر وہ شخص ہے جو کسی تعلیمی ادارہ سے ایک متعین کورس کو مکمل کرنے کے بعد ڈگری حاصل کر لے۔

انٹیلکچولس پڑھے لکھے لوگوں میں بھی ہوتے ہیں اور بے پڑھے لکھے لوگوں میں بھی۔ یہ لوگ معاملات کو تفکری انداز میں سمجھنا چاہتے ہیں۔ فکر و فہم ان کی غذا ہوتی ہے۔ وہ کسی بات کو اسی وقت مانتے ہیں جبکہ اس کو ان کی فکری سطح پر قابل فہم بنا دیا گیا ہو۔

10فروری1986

10-8 فروری 1986 کو غالب اکیڈمی (نئی دہلی) میں ایک سہ روزہ سیمینار ہوا۔اس کا موضوع اردو صحافت تھا اور اس کو اردو اکادمی نے منظم کیا تھا۔راقم الحروف نے بھی اس میں ایک مقالہ پڑھا۔

ایک ہندو صحافی دہلی سے ''مستانہ جوگی'' نام کا اردو اخبار نکالتے ہیں۔انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ میری پرورش لاہور میں ہوئی۔میں صرف اردو زبان جانتا ہوں۔مگر میرے بچوں کا حال یہ ہے کہ صرف ہندی اور انگریزی جانتے ہیں۔وہ اردو بالکل نہیں پڑھ سکتے۔یہی حال اب نئے ہندوستان میں بہت سے مسلم خاندانوں کا ہو رہا ہے۔

انہوں نے مزید کہا کہ ہندوستان کے اردو پرچوں کا حال یہ ہے کہ انہوں نے اردو کے ساتھ ہندی پرچے نکال رکھے ہیں۔مثلاً ''شمع'' اردو کا ماہنامہ ہے۔مگر اسی کے ماتحت اس نے ''ششما'' نام سے ہندی ماہنامہ نکال رکھا ہے۔اسی طرح اور بہت سے پرچے اردو کے ساتھ ہندی ایڈیشنز جاری کیے ہوئے ہیں۔تاکہ اگر اردو کی کشتی ڈوبے تو وہ ہندی کی کشتی پر سوار رہ سکیں۔مگر یہی بات آپ کسی ہندی پرچے میں نہیں پائیں گے۔یعنی کوئی ہندی پرچہ ایسا نہیں ہے جس نے ہندی کے ساتھ اردو کا پرچہ جاری کر رکھا ہے۔کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس ملک کا مستقبل ہندی کے ساتھ ہے۔

میرا خیال ہے کہ تاریخ کے بارے میں اس قسم کے اندازے اکثر صحیح نہیں ہوتے۔مثال کے طور پر تقسیم کے بعد عام خیال یہ تھا کہ ملک میں اردو کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا۔مگر چالیس سال بعد بھی اردو ختم نہیں ہوئی۔بلکہ آزادی کے وقت اور آج کی صورت حال کا موازنہ کیا جائے تو اردو کافی بڑھی ہے۔

دوسری بات ایک اور ہے جس کو اکثر لوگ بھول جاتے ہیں۔ہندوستان میں لکھنے والی اردو ضرور کم ہوئی ہے،مگر بولی جانے والی اردو میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ہندوستان کے ٹیلی وژن میں جو زبان استعمال ہوتی ہے،وہ واضح طور پر اردو ہوتی ہے،نہ کہ ہندی۔حقیقت یہ ہے کہ زبانوں کا تسلسل ختم ہونا انتہائی مشکل ہوتا ہے اور اردو بلاشبہ کوئی استثنا نہیں۔

ایگو کو مینج کرنا

میں نے آپ سے یہ سیکھا ہے کہ ماڈسٹی سے انسان کا ایگو ختم ہوجاتا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کا ایگو کبھی ختم نہیں ہوتا ہے۔ اس کو کیسے ختم کیا جائے۔ (ڈاکٹر سفینہ تبسم، سہارن پور، یوپی)

جواب

انا (ego) شیطان کی جانب سے انسان کے خلاف جدوجہد کا حصہ ہے۔ اس کو ختم نہیں کیا جاسکتا ہے، بلکہ اس کو مینج کرنا ہے۔ ایگو بار بار آئے گا۔ انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ شیطان کی جانب سے آئے ہوئے ایگو کو پہچانے، اور اس سے بچاؤ کی کوشش کرے۔ یہ سلسلہ موت تک جاری رہے گا۔ انسان کو بیدار (vigilant) رہنا ہے تاکہ وہ شیطان کے حملوں کو مینج کرنا سیکھے۔

انسان کے اندر انا (ego) کا جذبہ بہت زیادہ طاقت ور ہے۔ یہ جذبہ انسان کی ساری سرگرمیوں میں کام کرتا ہے۔ انسان کے لیے سب سے بڑی تباہ کن بات یہ ہے کہ وہ انا (ego) کا شکار ہوجائے۔ ایگو کے فتنے کا سب سے زیادہ مہلک پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے ہر عمل کا ایک جواز (justification) تلاش کرلیتا ہے۔ وہ غلط کام بھی کرتا ہے تو اس کا ایک مبرر (justified reason) اس کے پاس ہوتا ہے۔ وہ غلط کام کو اس یقین کے ساتھ کرتا ہے کہ وہ ایک درست کام ہے۔ یہ ایک خود فریبی کی بدترین صورت ہے۔

انا کا ایک نقصان یہ ہے کہ آدمی ذہنی جمود (intellectual stagnation) کا شکار ہوجاتا ہے۔ ایسا انسان حقیقت کے اعتبار سے وہ بے اصل خوش فہمیوں میں جیتا ہے، لیکن بطور خود یہ سمجھتا ہے کہ میں ایک ثابت شدہ حقیقت پر جی رہا ہوں۔ اس سے بچاؤ کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ کو ڈی کنڈیشنڈ مائنڈ بنائے۔ ڈی کنڈیشننگ کی بنا پر آدمی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچتا ہے، اس بنیاد پر وہ سچائی کو اس کی درست شکل میں دیکھتا ہے، اور اس کو قبول کرلیتا ہے۔ ہر آدمی کی یہ ایک اہم ذمے داری ہے کہ وہ اپنی ایگو کی کنڈیشننگ کو دریافت کرے، اور سیلف ہیمرنگ کے ذریعے اپنے ایگو کو مینج کرنا سیکھے۔

بہترین خطا کار

گناہ کے حوالے سے ایک پرامید حدیثِ رسول یہ ہے: اللہ ایک بندہ کو اس کے گناہ سے بھی فائدہ پہنچاتا ہے، جس گناہ کا ارتکاب وہ کر گزرتا ہے (إِنَّ اللّٰهَ لَيَنْفَعُ الْعَبْدَ بِالذَّنْبِ يُذْنِبُهُ) مسند الشہاب، حدیث نمبر 1095۔ گناہ سے انسان کیسے خدا سے قریب ہوسکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ گناہ اپنے آپ میں غلط عمل ہے، مگر وہ آپ کو نیکی کا موقع فراہم کرتا ہے۔ یعنی غلطی کا ارتکاب ہونے پر آپ سرکشی کا طریقہ اختیار نہ کریں، بلکہ ندامت کا احساس کرکے خدا کے آگے جھک جائیں۔ یہی عمل توبہ کہلاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ کبھی روٹین میں کیا جانے والا نیک عمل انسان کو خدا سے قریب نہیں کر پاتا ہے۔ لیکن ایک گناہ انسان کو خدا سے بہت زیادہ قریب کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ انسان کو اپنے گناہ پر شرمندگی کا احساس ہو، اور وہ سنجیدگی کے ساتھ توبہ واستغفار کا طریقہ اختیار کرے۔ گویا گناہ آپ کو یہ موقع دیتا ہے کہ آپ خدا سے قریب ہوجائیں۔ احساسِ گناہ کوئی معمولی عمل نہیں ہے۔ یہ آپ کی شخصیت میں تبدیلی کا دروازہ ہے۔ وہ خدا سے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کا ذریعہ ہے۔ آپ کی شخصیت جو گناہ سے پہلے عام شخصیت تھی، وہ گناہ کے بعد ایک ربانی شخصیت میں بدل سکتی ہے۔

احساسِ گناہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ احساسِ کمتری (inferiority complex) کا شکار ہو کر یہ سمجھ لیں کہ میں کوئی نیک عمل نہیں کرسکتا۔ ہر وقت مجھ سے گناہ اور غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ پھر اس کے بعد آپ ناامیدی کا شکار ہو کر دھیرے دھیرے ڈپریشن کا شکار ہوجائیں۔ یہ اسلام کی تعلیم نہیں۔ اسلام کی تعلیم ہے توبہ یعنی رپنٹنس (repentance) پھر نئی انرجی کے ساتھ نیک عمل۔

رسول اللہ اہل ایمان کو توبہ واستغفار پر بہت زیادہ ابھارا کرتے تھے۔ ایک صحابی حبیب بن حارث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: یارسول اللہ! مجھ سے گناہ ہوتے رہتے ہیں۔ آپ نے کہا: توبہ کرلیا کرو۔ اس نے کہا: اے اللہ کے رسول، میں توبہ کروں گا، لیکن دوبارہ میں گناہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا، جب جب گناہ کرو توبہ کرلو۔ اس نے کہا: تب میرے گناہ بہت زیادہ ہوجائیں گے۔ رسول اللہ نے کہا: اللہ کی معافی تیرے گناہوں سے بہت وسیع ہے (عَفْوُ اللّٰهِ أَكْثَرُ مِنْ ذُنُوبِكَ) المعجم الأوسط للطبرانی، حدیث نمبر 4854۔ (مولانا فرہاد احمد)

مولانا کے بعد

آج بتاریخ 14 اکتوبر 2022ء کو مولانا وحیدالدین خاں صاحب کی رہائش گاہ (نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی) پہنچا۔ گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا تو مولانا کی صاحبزادی ڈاکٹر فریدہ خانم (آپا) نے آواز دی کہ اوپر آجائیں۔ میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ بالآخر کسی طرح سیڑھیاں چڑھ کر مولانا مرحوم کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ میں جس شخصیت سے استفادے کے لیے ہمیشہ حاضر ہوا کرتا تھا، آج شدت سے مجھے اس کی غیر موجودگی کا احساس ستانے لگا۔ آنکھیں اشکبار تھیں۔ میرے کانوں میں مولانا کے چند سادہ اور محبوب کلمات گونج رہے تھے۔ مثلاً، ارے بھائی! دیکھو بھائی! سنو بھائی! وغیرہ۔ یہ گویا کسی درد مند دل کی پکار تھی۔ اِسی کے ساتھ یہ سوالات بھی سنائی دینے لگے: "اقبال صاحب! فیاض صاحب! کوئی نئی خبر، کوئی نیا تجربہ ہے آپ کے پاس۔۔۔؟" ایک مرتبہ ایک صاحب نے کہا تھا کہ کوئی خبر نہیں ہے۔ تو مولانا نے کہا کہ آپ یہ کیسے کہہ رہے ہیں۔ ہر دن نیا سورج نکلتا ہے، پوری کائنات اعلیٰ بندوبست کے ساتھ چل رہی ہے— کیا یہ خبر (نیوز) نہیں ہے۔ گویا مولانا کے نزدیک اخباری نیوز کوئی نیوز نہیں تھی، بلکہ حقیقی نیوز وہ تھی، جس سے معرفت کا رزق حاصل ہو۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ آج بظاہر سوال کرنے والا ہمارے سامنے موجود نہیں ہے، مگر سوال بدستور قائم ہے۔ تاکہ مولانا کے بعد بھی معرفت کا عمل رکے بغیر جاری رہے۔ مولانا کے کمرے میں خالی کرسی اور شیلف میں آویزاں اُن کے عبا کو پرنم آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا، ایک طرف خالی کرسی اور جبہ، دوسری طرف مولانا کی ساری تصنیفات۔ گویا کرسی اور ان کا جبہ زبان حال سے یہ کہہ رہے تھے کہ یہ شخصیت اب اِن کتابوں میں موجود ہے۔

پنج پیراں قبرستان میں: اس کے بعد پہلی بار مولانا وحیدالدین خاں صاحب کی قبر پر حاضری کا موقع ملا۔ بستی حضرت نظام الدین کے قبرستان پنج پیراں کے صدر دروازے سے داخل ہونے کے بعد سیدھے قبرستان کے آخری حصے میں ایک مزار کی مضبوط فصیل بنی ہوئی ہے۔ ٹھیک اس سے ذرا پہلے مولانا کی قبر موجود ہے۔ میری زبان گنگ تھی۔ ''السلام علیکم یا اہل القبور'' (اے قبر کے ساکنو، تم پر

سلامتی ہو) کے روایتی الفاظ زبان پر جاری تھے۔

قریب ہوا، اپنے ساتھی سے قبلہ معلوم کیا اور نماز جنازہ ادا کی۔ میرا دل مولانا کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہہ رہا تھا کہ مولانا! فی الوقت میں آپ کی قبر کے پاس ہوں۔ جس معرفت کی سطح پر آپ پہنچے ہیں اس کو لے کر مجھے اور میرے ساتھیوں کو آگے بڑھنا ہوگا۔ اس وقت میں قبرستان میں اسی اضطراب کے عالم میں کبھی میں قبر کے کتبہ پر ہاتھ لگاتا، کبھی قبر کو دیکھتا۔ گویا میں مولانا سے کچھ سننا چاہتا ہوں۔ مگر میرے شعور نے کہا کہ مولانا آپ نے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے کسی کی پرواہ کیے بغیر واضح طور پر خدا کی ہر بات کھول کھول کر بتادی، آخری حد تک خیرخواہی کردی (قَد بَلَّغتَ، وَأَدَّیتَ، وَنَصَحتَ)۔ اب مولانا خدا کے فطری قانون کے تحت ہم سے جدا ہوکر آخرت کے سفر پر روانہ ہوچکے ہیں۔ پھر یہ ہم لوگوں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ ہم نے مولانا کے ذریعہ جو عصری اسلوب میں اسلام پایا ہے اس کو آگے لے کر جائیں۔

بہرحال، اِنھیں کیفیات سے گزرتا ہوا سوچ رہا تھا کہ اچانک مجھے افطار کے وقت کی ایک دعا یاد آگئی: ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوقُ، وَثَبَتَ الْأَجْرُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 2357)۔ یعنی، پیاس چلی گئی اور رگیں تر ہوگئیں اور اللہ نے چاہا تو اجر وثواب قائم ہوگیا۔ اِس دعا کو میں اِس طرح پڑھنے لگا: ذهب روح مولانا و دفن الجسم و ارجو من اللّٰه ان یثبت له الفردوس (مولانا کی روح پرواز کرگئی۔ جسم قبر کے حوالے ہوگیا اور اللہ سے امید ہے کہ وہ اپنے فضل سے مولانا کو جنت الفردوس میں ٹھکانہ عطا فرمائے گا)۔ اور یہ بھی سوچا کہ مولانا کی روح جب پرواز کررہی تھی تو اس وقت بھی وہ اسی قسم کے الفاظ دہرا رہے ہوں گے: ذهب نفسی، و دفن جسدی و أرجو من اللّٰه ان یثبت اجری (میری روح پرواز کرگئی میرا جسم سپرد خاک ہوگیا امید ہے کہ میرا رب میرے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے گا)۔ گویا مولانا کی سادہ زندگی معرفت کی راہ کا "روزہ" تھا، موت ان کے لیے رفیق اعلیٰ سے ملاقات کا "افطار" بن گئی۔

حقیقت کی تلاش اور حقائق کی یافت کی خاطر ان کی ہڈیاں چٹخ گئیں اور رگوں کا خون خشک ہوگیا، پوری امید ہے کہ برزخ کی زندگی میں خدا نے انھیں ضرور تروتازہ رکھا ہوگا، اور اجر عظیم کا فیصلہ کیا ہوگا جس

کی رضا کی خاطر مولانا نے لوگوں کی ناراضگی کو برداشت کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ معرفت والا دین غائب ہو جائے اور رسمی عبادت باقی رہ جائے تو ازسرنو روحِ عبادت کو ڈسکور کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مولانا وحیدالدین خاں نے یہی کام سرانجام دیا ہے۔

داعی کا مشن: خدا امید کا سرچشمہ ہے۔ ایک سچے مومن کے لیے سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس کی ساری زندگی اضطراب میں گزرتی ہو، مگر اس کا خاتمہ پرامید ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ ایک 'معلوم مقام' کی طرف جارہا ہوتا ہے، یعنی آخرت اور خدا کی بنائی ہوئی ابدی جنت کی طرف۔ معرفتِ رب ہو یا معرفتِ آخرت، اس کی تذکیر کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ مگر شیطان غفلت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جوانوں کا موضوع نہیں، بوڑھے لوگوں کا موضوع ہے۔ کیوں وہ لوگ زندگی سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ انسان کی یہی سب سے بڑی نادانی اور سرکشی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ موت کی یاد اور اس کے لیے تیاری کا چرچا آج کل بہت کم ہوتا جارہا ہے۔ اگر کوئی داعی یا مربی معرفتِ رب یا فکرِ آخرت کی یاددہانی کراتا ہے تو ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ آخرت کے علاوہ بقیہ سارے موضوعات سے ہر دن روز ناچے یا اخبار ہمیں آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ مگر خدا کے منصوبۂ تخلیق کے مطابق، اصل تیاری آخرت کی ہے۔ جس کے لیے خالق نے اہتمام کے ساتھ انبیاء کرام کو منتخب کیا تھا۔ قرآن میں ہے: إِنَّآ أَخۡلَصۡنَٰهُم بِخَالِصَةٖ ذِكۡرَى ٱلدَّارِ (38:46)۔ بے شک ہم نے ان کو ایک خاص بات کے ساتھ مخصوص کیا تھا کہ وہ آخرت کی یاددہانی ہے۔

چنانچہ آخرت داعی کا خاص موضوع ہوتا ہے۔ مسائلِ دنیا تو غیر داعی کا موضوع ہے، مگر مسائل آخرت صرف ایک نبی اور ان کے بعد ان کے ماننے والے داعی کا موضوع ہوا کرتا ہے۔ یقیناً مولانا کی ہر بات آخرت رخی تھی۔ ان کی مجلسوں، ٹیلفونک گفتگو اور ان کی کتابوں سے میں نے یہی پایا ہے۔ وہ معرفت اور آخرت کے داعی بن کر دنیا میں رہے اور اسی حالت میں وہ اس دنیا سے چلے گئے۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے آخری حد تک اپنی صلاحیتوں کی قربانی دی۔ انھوں نے اللہ کی عبادت کو مقصد اور اس کی طرف بلانے کو اپنا مشن بنایا، ان کی ساری تحریروں کو اسی نقطہ نظر کے تحت سمجھا جاسکتا ہے۔ (مولانا سید اقبال احمد عمری، عمرآباد)

تعارفِ کتب

تربیت اولاد

ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ" کسی باپ کی طرف سے اپنی اولاد کو سب سے عمدہ وراثت اچھا ادب سکھانا ہے" (المعجم الاوسط، حدیث نمبر 3658)۔ کہتے ہیں کہ گھر بچہ کا پہلا مدرسہ (اسکول) ہوتا ہے۔ جہاں وہ سب سے پہلے اپنے والدین، گھر کے ماحول اور گھر کے باقی افراد سے غیر رسمی طور پر بہت کچھ سیکھتا ہے۔ اور بچہ کی پرورش، نمو اور تربیت کا یہی وہ اہم ترین دور ہوتا ہے جس میں ہر سکھائی یا سیکھی گئی بات (چاہے وہ صحیح ہو یا غلط) بچہ کے دل و دماغ میں نقش ہو جاتی ہے اور عملی طور پر زندگی بھر وہ اس کو یاد رکھتا ہے۔

یعنی اگر گھر کا ماحول بہتر ہوگا تو بچہ کی پرورش اور تربیت بھی بہت صحیح انداز میں ہوگی۔ ظاہر ہے گھر کا ماحول والدین کی بہتر سوچ اور عمل سے ہی بہتر ہو سکتا ہے۔ اگر والدین کو خود تربیت کی ضرورت ہو تو وہ اپنے بچوں کی تربیت کیسے کر پائیں گے۔ اس لیے کہ تربیت یافتہ ہی دوسروں کی بہترین تربیت کر سکتے ہیں۔ اور یہی ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ والدین کی اکثریت یہی سوچتی اور سمجھتی ہے کہ بچے کی تربیت اسکول، مدرسہ، کالج یا یونیورسٹی کرتی ہے۔ ان کی ساری امیدیں اور امنگیں ان رسمی تعلیمی اداروں سے وابستہ ہوتی ہیں، وہ بچے کی پہلی درسگاہ (گھر) کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ایسے لوگ پھر بچوں کے بگاڑ کے ذمہ دار بھی ان تعلیمی اداروں کو ٹھہراتے ہیں۔

تربیتِ اولاد کے موضوع پر بہت ساری کتابیں اور مضامین لکھے جا چکے ہیں ان کو بے شک پڑھیں لیکن 80 صفحات پر مشتمل زیر تبصرہ کتاب" تربیت اولاد" اس موضوع پر مختصر مگر ایک جامع اور شاندار کتاب ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس کے مصنف کی علمی و فکری شخصیت سے کیا جا سکتا ہے، جو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ نہ صرف سنجیدہ والدین کو بلکہ علم و دانش سے تھوڑا بہت شغف رکھنے والے ہر فرد کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ یہ کتاب معاشرے کے ہر فرد کے لیے ایک نایاب تحفہ ہے۔ فرد بدلے گا تو خاندان بدلیں گے اور اس طرح معاشرہ بہتر سے بہترین کی طرف سفر کرے گا۔ یقیناً آپ احباب نے اس موضوع پر اب تک کئی کتابیں پڑھی ہوں گی لیکن ایک

موقع اس چھوٹی سی کتاب کو بھی دیجیے جو ہماری نسلوں کی بقا جیسے اہم مقصد کے تحت لکھی گئی ہے۔

کتاب کے صفحہ 11 کا ایک پیرا گراف ملاحظہ کیجیے: " آج کل ہر باپ اپنی اولاد کی شکایت کرتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر باپ کو خود اپنی شکایت کرنا چاہیے۔ عام طور پر والدین یہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے گھر کے ماحول کو سادہ نہیں بناتے۔ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ رہتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کے ہر شوق کو پورا کرسکیں۔ وہ اپنے بچوں کو " ٹی وی کلچر " کا عادی بنا دیتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو گھروں کے بگاڑ کا اصل سبب ہے۔ اس بگاڑ کی تمام تر ذمے داری والدین پر ہے، نہ کہ اولاد پر "۔ (طاہر حجازی، کراچی، پاکستان)۔

مذہب اور جدید چیلنج

موجودہ دور میں الحاد (Atheism) کا نظریہ پھیل رہا ہے۔ موجودہ الحاد سائنس اور فلسفے کے جلو میں نمودار ہوا ہے جس نے پڑھے لکھے طبقے کو متاثر کیا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ الحادی فکر سے متاثر ہو رہا ہے۔ یہ لوگ اگرچہ صراحتاً خدا کے وجود کے منکر نہیں بنے لیکن تشکیک (agnosticism) میں ضرور مبتلا ہوئے۔ موجودہ سائنسی علوم کا ارتقا جن شخصیات کے ہاتھوں ہوا وہ یا تو خدا کے وجود کے منکر تھے یا متشکک (agnostic)۔ لہٰذا وقت کی بڑی اہم ضرورت تھی کہ موجودہ الحادی فکر کو سائنس کی روشنی میں ردّ کیا جائے اور سائنس سے خدا کے وجود کا اثبات کیا جائے۔ مولانا وحید الدین خان صاحب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور سائنسی مسلّمات کی روشنی میں الحادی فکر کا ردّ کیا۔ مولانا چونکہ انگریزی زبان سے گہری واقفیت رکھتے تھے، لہٰذا انہوں نے سائنسی اور الحادی مواد کا اصل سورس سے مطالعہ کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ الحاد کا ایسا ردّ سائنس کی روشنی میں کسی اور شخصیت نے نہیں کیا جیسا انہوں نے کیا۔ اس ضمن میں ان کی اہم کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ مذہب اور سائنس　　2۔ مذہب اور جدید چیلنج،

3۔ عقلیاتِ اسلام　　4۔ خدا کی دریافت: سائنسی حقائق کی روشنی میں۔

دینی مدارس کے طلبہ وعلما کو ان کتابوں کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ یہ کتابیں سی پی ایس انٹرنیشنل کی ویب سائٹ (www.cpsglobal.org/books) پر بھی موجود ہیں۔ (ڈاکٹر فرخ نوید، پاکستان)

1۔ **میں نے مولانا صاحب سے کیا سیکھا:** مولانا وحید الدین خاں صاحب سے میں نے وہ سب سیکھا جو کسی اور سے نہ سیکھا۔ مولانا صاحب جیسی ہستی سے کاش بہت پہلے ہی تعارف ہوجاتا تو تعصّبات اور فرقہ واریت اور مذہبی ظاہر پرستی میں اپنے قیمتی ایام ضائع نہ کرتا۔ خیر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے مولانا وحید الدین خاں کی شکل میں عظیم رہنما اور غیر معمولی شخصیت سے ملاقات کروادی۔ مولانا صاحب کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ اصحاب رسول اور انبیاء کرام کا خشیت الٰہی اور معرفت کا کتنا عظیم لیول ہوگا۔ مولانا صاحب کے بارے میں سب سے پہلے جناب ابویحییٰ صاحب (ادارہ انذار) نے بتایا تھا۔ اس کے بعد میں نے مولانا کی پہلی تقریر انٹرنیٹ پر سنی اور پہلی کتاب 2017 میں پڑھی۔ پھر مولانا کے ہی ہو کر رہ گئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مولانا کو میری زندگی میں شامل کر دیا۔

میں لفظوں میں کیسے بتاؤں کہ مولانا صاحب نے میری زندگی میں کیا تبدیلی پیدا کی ہے۔ مولانا کی بدولت—

• دین کی اصل روح اور حقیقت سے آشنائی ہوئی • مثبت انداز فکر اور معرفت الٰہی کو سمجھنے میں مدد ملی • زندگی کی بے ثباتی اور موت کی حقیقت آشکار ہوئی • عام مذہبی فکر سے اعراض اور اصل اسلام کی پہچان ہوئی • قرآن سے تعلق اور اس کو بنیادی اور مرکزی حیثیت دینے میں مدد ملی • اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ ایمان واخلاق اور تزکیہ نفس ہی نجات کا اصل ذریعہ ہے • مالک کے تخلیقی منصوبہ کا فہم حاصل ہوا • صبر وشکر کی اہمیت اور اصل روح سے آشنائی ہوئی • انفس وآفاق کی نشانیوں اور کائنات میں تدبر اور تفکر کرنا پیدا ہوا • مالک کائنات کی کبریائی اور عظمت کا ادراک ہوا۔ خواہش تھی کہ آپ جب کبھی پاکستان آئے تو ضرور ملاقات کا شرف حاصل کروں گا لیکن اس فانی دنیا میں یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ ان شاء اللہ رب العالمین جنت میں یہ موقع ضرور دے گا۔ (طارق سلیم، گورنمنٹ ہائی سکول، ضلع پاک پٹن)

2۔ 3 مئی 2022 کو سی پی ایس سہارن پور نے اپنے سینٹر پیس ہال میں عید ملن پروگرام کا انعقاد کیا تھا، جس میں سماجی اور سیاسی اور بیوروکریسی سے تعلق رکھنے والے افراد شریک ہوئے۔ ان تمام لوگوں کو سہارن پور ٹیم کی جانب سے بطور عید گفٹ دعوتی لٹریچر دیا گیا۔ اسی طرح 25 مئی 2022 دہلی لیلا پیلیس میں ڈاکٹر اسلم کو امن وشانتی کے میدان میں کام کرنے لیے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ایوارڈ دینے کے لیے مرکزی وزیر مسٹر انوراگ ٹھاکر آئے تھے۔ ان کو اور دوسرے مہمانوں کو دعوتی لٹریچر دیا گیا۔ تمام لوگوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا، اور کتابیں پڑھنے کا وعدہ کیا۔

3۔ کتاب میلہ (Book Fair) حصولِ علم ومعلومات کا وسیلہ ہے۔ یہاں پر علم اور مطالعہ سے دلچسپی رکھنے والے لوگ آتے ہیں۔ اس لیے مولانا وحید الدین خاں صاحب ہمیشہ سی پی ایس ٹیم کو بک فیئر میں شرکت پر ابھارا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ سی پی ایس انٹرنیشنل ہمیشہ نیشنل اور انٹرنیشنل سطح پر منعقد ہونے والے بک فیئر میں شریک ہوتا رہا ہے۔ مثلاً 6-3 نومبر 2021 کو شارجہ میں انٹرنیشنل بک فیئر لگا تو اس میں گڈورڈ بکس نے شرکت کی۔

چنئی بک فیئر: مولانا اسرار الحسن عمری (چنئی) کے مطابق، چنئی بپاسی (BAPASI) کے زیر اہتمام منعقد 45 واں بک فیئر 16 فروری 2022 کو شروع ہوا اور 6 مارچ 2022 کو اختتام پذیر ہوا۔ اس بک فیئر میں چنئی گڈورڈ تقریباً دس سالوں سے حصہ لے رہا ہے۔ اس بار گڈورڈ کو چنئی BAPASI کی ممبر شپ بھی حاصل ہو گئی ہے۔ اس سال بک فیئر میں تقریباً آٹھ سو پبلشرز نے حصہ لیا۔ بک فیئر آنے والی پبلک کی تعداد پندرہ لاکھ تک بتائی جارہی ہے۔ اس بک فیئر سے پتا چلا کہ جہاں لوگوں میں ڈیجیٹل کتابوں کا رجحان بڑھا ہے، وہیں لوگوں کی کثیر تعداد ہارڈ کاپی میں مطالعہ کرنا پسند کرتی ہے۔ اس مرتبہ سی پی ایس چنئی نے تمل زبان میں دو کتابیں ریلیز کیں: تمل ترجمۂ قرآن کا روائز ڈ ایڈیشن اور گاڈ ارائزز کا تمل ترجمہ۔ پبلک نے دونوں کتابوں کو بہت پسند کیا۔ بہت سے لوگوں کو ہم نے یہ کتابیں بطور تحفہ بھی پیش کیں۔ اس سال ہمارے اسٹال پر جو لوگ آئے ان میں ایک معروف نام تامل اور ملیالم ٹی وی ایکٹریس مز شبانہ شاہجہاں ہیں۔ انھوں نے کچھ کتابیں خریدیں، مثلاً لیڈنگ اے اسپریچول لائف۔ اس کے علاوہ ان کو پرافٹ آف پیس بطور تحفہ دی گئی۔ اس کتاب میلے سے یہ احساس بڑھا کہ الرسالہ مشن کی تمام کتابوں کا تمل ترجمہ ہم کو جلد از جلد کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

لکھنؤ بک فیئر: لکھنؤ بک فیئر (23rd Sep to 2nd Oct 2022) میں سی پی ایس ممبران مولانا سید اقبال احمد عمری، خطیب اسرار الحسن عمری (چنئی) اور مسٹر آصف خان (کانپور) اسٹال کا انتظام سنبھالا۔ یہاں بھی کافی تعداد میں پبلک اسٹال پر آئی، اور قرآن و دیگر لٹریچر حاصل کیا۔ یہاں انگریزی کتابوں کی بہت ڈیمانڈ تھی۔ اس کے علاوہ دوسرے مقامات پر ہونے والے بک فیئر میں سی پی ایس انٹرنیشنل کی مختلف ٹیموں نے حصہ لیا۔ مثلاً سی پی ایس پاکستان نے جن بک فیئر میں حصہ لیا، وہ یہ ہیں: اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی بک فیئر اسلام آباد (18-14 دسمبر 2021)، جی سی یونیورسٹی بک فیئر (23-20 دسمبر 2021)، انٹرنیشنل بک فیئر کراچی (30 Dec'21 to 3 Jan'22)، پریمیر بک فیئر لاہور (13-11 مارچ 2022)، فیصل آباد اگریکلچر یونیورسٹی بک فیئر (31-27 مارچ 2022)، لاہور بک فیئر (15-12 مئی 2022)، بک فیئر مجلس ترقی ادب، لاہور (14-11 اگست 2022)۔ اس کے علاوہ امریکا کے ایریزونا میں 13-11 مارچ 2022 اور آسٹن (ٹیکساس) میں 6-5 نومبر 2022 کو بک فیئر لگا۔ ان میں سی پی ایس امریکا نے شرکت کی۔ ان تمام بک فیئر میں آنے والے لوگوں میں تراجم قرآن کے علاوہ معرفت خدا اور امن عالم، وغیرہ کے موضوعات پر کتابیں تقسیم کی گئیں۔

4. I am, Muhammad Sohaib From England, and I am a Physiotherapist here. Every day I watch Maulana Wahiduddin khan's videos. I learned many things. Please upload the video at least once a week, and your Background Islamic tone is very effective and heart-touching. Please include this background tone in every Video. Thanks
5. I pray for you and send my best wishes regarding this magnificent deed of Tableegh e Deen. Undoubtedly the youngsters of today direly need to understand the Almighty's message, the Quran, through the books of Maulana Waheedudin Khan. (Muhammad Rafique [qrafi*****@yahoo.com])

NEW RELEASE

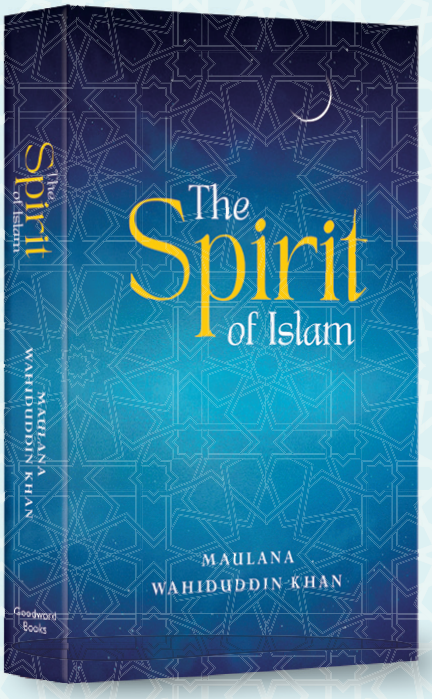

A GREAT BOOK FOR UNDERSTANDING THE SPIRITUAL ESSENCE OF ISLAM

- This book focuses on the spirit of Islam
- It aims to inculcate God-consciousness in a believer
- It also aims to instill well-wishing towards fellow human beings.
- It trains its readers for constant self-introspection

It has beautifully explained how a believer's life experiences are an opportunity for purification of the soul

To order call: 8588822675
sales@goodwordbooks.com
MRP Rs. 260
Pages 488

Download PDF of
The Spirit of Islam
www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

www.goodwordbooks.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO
Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23